مجلۂ علومِ اسلامیہ

نمبر ۱، ۲

جون ، دسمبر ١٩٦٤

ادارۂ علوم اسلامیہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جلد ۵ جون ، دسمبر ۱۹٦٤ نمبر ۱ ، ۲

مجلۂ علوم اسلامیہ

اڈیٹر

ڈاکٹر مختارالدین احمد

ادارۂ علوم اسلامیہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجلس ادارت

مجلۂ علوم اسلامیہ سال میں دو بار شائع ہوتا ہے

ایک شمارے کی قیمت پانچ روپے

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلۂ علوم اسلامیہ

جون، دسمبر ١٩٦٤ م

فہرست مضامین

مقالات :

معلومات و مراسلات :

* *
*

عربوں کا علم المثلثات

شبیر احمد خاں غوری*

اس عنوان سے جناب پروفیسر محمد فضل الدین قریشی صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور کا ایک مقالہ «مجلۂ علوم اسلامیہ» جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ مقالہ میرے مضمون «البیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقا» پر جو اسی رسالے (جون ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا تھا، تنقید ہے۔ میں قریشی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میری اس ناچیز پیش کش کو در خور اعتنا سمجھا۔ ان کی تنقید کے جواب کی تو چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ دو چیزوں کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں: قریشی صاحب کا فرمانا ہے کہ میں نے مسئلے کی تاریخی جہت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ دوسرے میں نے «چہار مقالہ» نظامی عروضی سمرقندی کی اس حکایت کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ جس میں سلطان محمود غزنوی کے بوعلی سینا اور دیگر افاضل خوارزم سے طلب کرنے کا مذکور ہے، حالانکہ زحاؤ نے اسے ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔ ذیل میں انھی دو باتوں کے متعلق مجھے اپنے موقف کی وضاحت کرنا ہے۔

علم المثلثات کے ارتقا کا تاریخی پس منظر:

قریشی صاحب کا فرمانا ہے: «ریاضی کے اس موضوع (علم المثلثات) سے قطع نظر انھوں نے یا تو عرب فضلاء کے مختصر سوانح حیات بیان کیے ہیں یا ان کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے۔۔۔ عربوں کے ہاں علوم کی جو

(*) شبیر احمد خاں غوری، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش الٰہ آباد۔

تصویر انھوں نے کھینچی ہے وہ گو رنگین و دلکش ضرور ہے لیکن اپنے اصلی خد و خال سے مبرا ہے۔ غرض یہ کہ تصویر کا ایک دھندلا سا خاکہ ناظرین کے پیش نظر ہے اس خاکے کے کھینچنے میں بھی اُن سے کئی جگہ تسامح ہوا ہے»۔

(الف) میں نے مسلم علم المثلثات کے ارتقا کو اس کے تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح اس کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے، کیونکہ اس عاجز کا خیال ہے کہ انسانی کاوشیں، خواہ فکری ہوں یا عملی، خلا میں پروان نہیں چڑھا کرتیں بلکہ تاریخی عوامل ہی اُن کا رخ متعین کیا کرتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی تحریک کے ارتقا کی سائنٹفک توجیہ کے لیے ان تاریخی عوامل کا تجزیہ اشد ضروری ہے، جن کے ماحول میں وہ ظہور پذیر ہوئی۔ ان عوامل میں سب سے زیادہ مؤثر اس وقت کی سیاسی تحریکات ہوتی ہیں۔ دوسرے اہم عوامل معاشی اور مذہبی دواعی قرار دیے جاسکتے ہیں۔

فلسفۂ تاریخ کے اس اصول نے سب سے زیادہ مسلم علم الهیئت کو متأثر کیا ہے۔ اس کی تدریجی ترقی سیاسی تقلبات ہی کی رہین منت ہے۔ اسلامی ہیئت کے ہزار رسالہ عروج و زوال کا اس اصول کی روشنی میں جائزہ لینا تو مشکل ہے، صرف چوتھی صدی ہجری کی ہیئتی ترقی کو لیا جاتا ہے۔

۱—اس عہد (چوتھی صدی ہجری) کی تاریخ مشاہیر علمائے ہیئت کے کارناموں سے معمور ہے اور اسے بجا طور پر مسلم علم الهیئت کا «عہد زرین» کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ عہد قلمروئے خلافت کے ضعف و انحلال کا بدترین زمانہ بھی ہے۔ اس ضعف و انحلال میں جن فارق المرکز قوتوں نے کام لیا، اُن میں سب سے اہم ایرانی قوم پرستی کا جذبہ تھا، جو اس زمانہ میں عجمی عصبیت یا «شعوبیت» کہلاتا تھا۔ اس جذبے نے مختلف شکلیں اختیار کیں جن میں سب سے زیادہ خطرناک باطنی یا قرمطی تحریک تھی۔ یہ ایک خفیہ تحریک تھی جو اسلام کی بیخ کنی

اور ایرانی سلطنت کو بحال کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی[1]. مگر اس میں اور بھی اسلام دشمن عناصر مثلاً یہود، زنادقہ اور فلاسفہ شامل ہو گئے تھے[2]. ان میں سے مؤخرالذکر کے لیے عبید اللہ بن الحسن القیروانی نے سلیمان بن الحسن بن سعید الجابی کو مشورہ دیا تھا: «و إذا ظفرت بالفلسفی فاحتفظ به فعلی الفلاسفة معولنا و انا و ایاهم مجمعون»[3] لہذا شروع ہی سے باطنیوں کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف تھا، چنانچہ ان کے اس فلسفیانہ میلان کے بارے میں شہرستانی نے لکھا ہے: «ثم ان الباطنیة القدیمة قد خلطوا کلامهم ببعض کلام الفلاسفة و صنفوا کتبهم علی ذلک المنهاج»[4] اس طرح باطنیوں کی آئیڈیالوجی فلسفہ کی تعلیمات پر استوار ہوتی رہی[5]. اور اس پیہم کوشش کا نتیجہ «رسائل اخوان الصفا» کی شکل میں نمودار ہوا جو جو باطنی حلقوں کی «کتاب مقدس» سمجھے جاتے تھے، چنانچہ شیخ

(۱) «و ذکر أصحاب التواریخ ان الذین وضعوا اساس دین الباطنیه کانوا من أولاد المجوس و کانوا مائلین الی دین اسلافهم . . و یوکد ما قلنا من أهل الباطنیة الی دین المجوس، انا لانجد علی ظهر الارض مجوسیاً و هو موادهم منتظر الظهور هم علی الدیار یظنون ان الملک یعود الیهم بذاک». (البغدادی: الفرق بین الفرق: ۲۶۹-۲۷۱)

(۲) «واتفق اهل المقالات ان اول من أسس هذا المذهب المشؤم قوم من ولاد المجوس و بقایا الخرمیة و الفلاسفة و الیهود» (الدیلمی: قواعد عقائد آل محمد: ۳۱)

(۳) «البلاغ الاکید و الناموس الاعظم» بحوالۂ الفرق بین الفرق: ۲۷۸ اسی طرح دیلمی نے لکھا ہے: «و من وجدوه فیلسوفاً فهو منهم قد وصل الحبیب الی المحبوب لان کلهم یشبهون لکل ظاهر باطناً (قواعد عقائد آل محمد: ۲۸)

(۴) الشهرستانی: کتاب الملل والنحل (۱: ۹۰)

(۵) مقریزی نے باطنی دعوت کی منازل تسعہ میں سے چھٹی دعوت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے دیکھیے الخطط والآثار (۲: ۲۳۲). نیز اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ آخری منزل میں تو مرید کو صرف فلسفے کی کتب ہی کے پڑھنے کا مشورہ دیا جاتا تھا (ایضاً ۲: ۲۳۳)

بو علی سینا کے گھر میں بھی جو باطنیت کا پیرو تھا، اس کتاب کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔[1] خود شیخ بھی اس کے مباحث پر غور و خوض کیا کرتا تھا[2]۔

فلسفہ کا اہم جزء ریاضی و ہیئت پر مشتمل ہے، چنانچہ «رسائل اخوان الصفا» کی پہلی جلد کا بیشتر حصہ انہی علوم پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ریاضیات کی تعلیم باطنی دعوت میں اہم مقام رکھتی تھی۔ ابو عبداللہ بن رزام جو اس تحریک کا قدیم ترین مؤرخ ہے، دعاۃ کے بارے میں لکھتا ہے «ومن شأن دعاتهم ان ينتقلوا فی الارض . . وان يتحلی بطرف من الهندسة و معان من تهاويل الفلاسفة[3]»۔

چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی عبداللہ بن میمون القداح[4]، محمد بن الحسین زیدان[5]، حمدان بن قرمط[6]، ابو سعد الجنابی[7] وغیرہم فلسفہ اور

(۱) چنانچہ شیخ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے: «وكان أبی ممن اجاب داعی المصريين و يعد من الاسماعيلية و قد سمع منهم ذكر النفس والعقل علی الوجه الذی يقولونه ويعرفونه هم وكذلك أخی كانوا ربما تذاكروا بينهم وأنا أسمعهم . . . ويحرون علی السنتهم ذكر الفلسفة والهندسة وحساب الهند»۔ (سرگزشت ابن سینا مرتبہ سعید نفیسی صفحہ ۱)

(۲) بیہقی شیخ کے بارے میں لکھتا ہے: وأبوه كان يطالع ويتأمل رسالة اخوان الصفا وهو ايضاً احياناً يتأمله»۔ (تتمۃ صوان الحکمۃ: ۴۰)

(۳) مقدمۂ کشف اسرار الباطنیہ: ۱۸۹

(۴) وكان الملعون عارفاً بالنجوم . . . . وكان من أحبار اليهود و اهل الفلسفة الذين يعرفون جميع المذاهب»۔ (کشف اسرار الباطنیۃ: ۱۹۷)

(۵) «وكان هذا الرجل متفلسفاً حاذقاً بعلم النجوم» (الفہرست: ۲۶۷)

(۶) «كانا يعرفان النجوم و احكام الازمان فدلهما الوقت علی تاسيس ما عملاه»۔ (کشف اسرارالباطنیہ: ۱۹۸)

(۷) «كان فيلسوفاً ملعوناً ملك البحرين واليمامة والاحساء» (ایضاً: ۲۰۰)

چنانچہ جب وہ (ابو سعید الجنابی) شکست کھا کر ہجر واپس گیا تو ایک قصیدہ

نجوم کے ماہر تھے لیکن نجوم و ہیئت کے ساتھ باطنیوں کے غیر معمولی شغف و اعتناء کا موجب یہ افواہیں تھیں کہ تیسری صدی کے خاتمہ پر مسلمانوں کا دین فنا اور عربوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے اور ان کی جگہ ایرانی سلطنت قائم ہوگی اور مجوسی مذہب بحال ہوگا ، کیونکہ ستارے اسی کی پیشین گوئی کرتے ہیں ۔ عبد القاہر بغدادی نے لکھا ہے :

« وربما استدل اغمارهم علی ذالک بما یرویه المجوس عن زرادشت انه قال لکشتاسپ ان الملک یزول عن الفرس الی الروم والیونانیة ثم یعود الی الفرس ثم یزول عن الفرس الی العرب ثم یعود الی الفرس . وساعده جاماسپ علی ذلک و زعم ان الملک یعود الی العجم لتمام الف و خمس مائة سنة من ظهور زرادشت »[1].

مجوسیت پسند نجومی اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت تیسری صدی کا اختتام بتاتے تھے اور یہی وہ وقت ہے کہ معتضد باللہ (۲۷۹ - ۲۸۹ ھ) کے کمزور جانشینوں کے زیر حکمرانی عباسی خلافت دم توڑ رہی تھی[2]. اس لیے اسلام بیزار حلقوں میں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا ۔ پہلے محمد بن الحسین زیدان کو اپنے متعلق یہ مغالطہ رہا کہ میں اس انقلاب کو انجام دونگا ۔[3] اس کے مرنے پر ابو سعید الجنابی اس

لکھا ، جس میں احکام نجوم کے مطابق اپنی فتح کی پیشین گوئی کی ہے :

اغرکم منی رجوعی الی هجر — عما قلیل سوف یأتیکم الخبر
و اذا طلع المریخ فی ارض بابل — وقارنه النجمان فالحذر الحذر
سأملک اهل الارض شرقاً ومغربا — الی قیروان الروم والترک والخزر

(۱) البغدادی: الفرق بین الفرق : ۲۷۱ نیز دیکھیے الآثار الباقیة ۲۱۳

(۲) « وقد وافق الوقت الذی ذکره ایام المکتفی و المقتدر و اخلف موعدهم و ما رجع الملک فیه الی المجوس . وکانت القرامطة قبل هذا المیقات یتواعدون فیما بینهم ظهور المنتظر فی القرن السابع فی المثلثة الناریة » (الفرق : ۲۷۱)

(۳) « فخبرنی عنه الثقة انه کان یزعم انه وجد فی الحکم النجومی [illegible] دولة الاسلام الی دولة الفرس .... فکان یقول فانی لارجو ان اکون [illegible] ذلک » (الفهرست : ۲۶۷)

خوش فہمی میں مبتلا رہا۔ مگر سنہ ۱۵۰۰ زرادشتی بھی گزر گیا اور پیشین گوئی نہ پورا ہونا تھی نہ پوری ہوئی۔[1]

باایںہمہ باطنی پروپاگنڈے نے اپنی دسیسہ کاریوں کو ختم نہیں کیا چنانچہ جب آل بویہ بغداد پر قابض ہوگئے (۳۳٤ ھ) تو اس پیشین گوئی کا مصداق انہیں بنادیا۔ لیکن البیرونی اس پر بڑی سخت تنقید کرتا ہے[2]۔

بہر حال اس قسم کی مایوسیوں کے دو ہی نتیجے ہوسکتے تھے یا تو احکام نجوم کی اصابت پر سے یقین اٹھ جائے، یا ان پیہم تکذیبوں کو نجومی حساب کی غلطی کا نتیجہ سمجھا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس مسئلے پر غور کیا کہ نجومی پیشین گوئی پر کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا ہے، جیسے فارابی (المتوفی ۳۳۹ ھ) نے «مقالة فی الجهة التی یصحّ علیها القول باحکام النجوم»[3] میں یا ابو جعفر الخازن نے «کتاب العالمین»[4] میں لیکن

(۱) «و فی آخر سنة الف ومائتین واربعین للإسكندر (۳۱۸ ھ) تم من تاریخ زرادشت الف و خمس مائة سنة و ما عاد فیها ملک الارض الی المجوس بل اتسع بعدها نطاق الاسلام فی الارض . . . و فی هذا زعم أمة الباطنية والمجوس الخاماسية الذين حكموا العود الملك اليهم» (الفرق: ۲۷۲)

(۲) «وظهرت دولة الديلم لعلی بن بويه الملقب بعماد الدوله فی القرآنات النارية وهذا هو الوعد الذی كانوا يتواعدون به فی عود الدولة الی الفرس وان لم تكن سيرتهم هی الدولة. ولست ادری كيف آثروا دولة الديلم دلالة انتقال الامر الی المثلثة النارية اظهر دلالة على دولة بنی العباس وهی دولة خراسانية شرقية ثم كلاهما بعيدان عن تجديد دولتهم وابعد عن اعادة دينهم» (الآثار الباقية: ۲۱۳)

(۳) اس موضوع پر فارابی کا ایک اور رسالہ بھی ہے جس کا نام «النكت فيما يصح و ما لا يصح من احكام النجوم» ہے۔ ڈیٹریشی نے اس کے دیگر رسائل کے ساتھ اسے بھی ۱۸۹٦ء میں شائع کیا تھا۔

(٤) ابن ابی الحدید: شرح نہج البلاغة (۱: ۷۵)

«واعلم ان الناس قد اختلفوا فی احكام النجوم فانكرها جمهور المسلمین و المحققین من الحكماء و قد وقفت لابی جعفر محمد بن الحسین الصنعانی المعروف بالخازن صاحب كتاب «زيج الصفائح» علی كلام فی هذا الباب مختصر له سماه

نجوم پسندی ایران کے مزاج میں رچی ہوئی تھی اس لیے عام رجحان اس کی اصابت ہی کی طرف رہا ۔ البتہ پیہم غلطیوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہیئتی مشاہدات اور فلکیاتی حسابات میں مزید دقت نظری کی ضرورت کا احساس شدید سے شدید تر ہونے لگا۔

فلکیاتی اعمال میں اسی دقت نظری کی ضرورت کے احساس نے چوتھی صدی ہجری کو اسلامی ہیئت کی تاریخ کا عہد زریں بنا دیا، کیونکہ ہرچند ایرانی قوم پرست سب کے سب قرمطی یہ تھے[1]، مگر قوم پرستی کے نام پر اور احاسِ (عربوں) کے اقتدار سے نفرت کے نتیجے میں انہیں علی العموم اس احیائی تحریک سے دلچسپی تھی۔ لہذا افاضل روزگار جن کی بہت بڑی اکثریت قرمطی نہیں تھی، ہیئت و فلکیات کی ترقی میں سرگرم و کوشاں نظر آتے ہیں اس کا ایک اجمالی تذکرہ سابق میں پیش کیا جاچکا ہے[2]۔

۲۔ یہ بھی تاریخ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ وہی عوامل جو ایران کے دوسرے صوبوں میں علم الہیئت کی ترقی کے سلسلے میں شدت سے موثر ہوتے ہیں، محمود غزنوی کی قلمرو میں اس کے جمود و بے اعتنائی کا باعث بن جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی تاریخی تعلیل ہی کا نتیجہ ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ہر چند کہ عباسی خلافت کا حقیقی اقتدار ختم ہوچکا تھا اور خلفاء کی حیثیت شطرنج کے مہروں سے زیادہ نہ تھی مگر

« کتاب العالمین » : قال ان بعض المصدقین باحکام النجوم و کل المکذبین بها قد زاغوا عن طریق الحق والصواب فان الکثیر من المصدقین بها قد ادخلوا فیها ما لیس فیها وادعوا ما لم یکن درکه بها حتی کثر فیها خطؤهم و ظهر کذبهم وصار ذالک سبباً لتکذیب اکثرالناس بهذا العلم » .

(۱) چنانچہ البیرونی اور ابو نصر بن عراق جو علم الهیئت اور المثلثات کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، باوجود شعوبی ہونے کے قرمطی نہیں تھے۔ ملاحظ ہو « معارف » اعظم گڑھ (اگست ۱۹۶۰): البیرونی کا مذہب صفحہ ۱۰۶ ـ ۱۱۰

(۲) مجلۂ علوم اسلامیہ جلد دوم شمارہ ۱ (جون ۱۹۶۱ء) ص ۴۴ ـ ۸۰

فاطمیین مصر کے عروج سے جنھیں قرامطہ کی تائید حاصل تھی، یہ براے نام سربراہی بھی معرض خطر میں نظر آرہی تھی۔ اس لیے القادر باللہ عباسی نے جب محمود کو اس کے بھائی کے مقابلے میں سبکتگین کی سلطنت کا وارث تسلیم کیا تو اس سے قرامطہ کے استیصال کا عہد لے لیا کیونکہ یہ لوگ مشرق میں مصر کے اسماعیلی خلفاء کے ہوا خواہ تھے اور محمود نے اس عہد کو آخر تک نبھایا۔ لہذا وہ اُن تمام سرگرمیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا جو ایرانی احیائیت پسندی سے وابستہ تھیں، یا ان کا شعار تھیں۔ انھیں میں فنون نجوم و ہیئت بھی تھے اسی لیے محمود کی قلمرو میں نجوم و ہیئت کی ترقی کا کوئی چرچا سننے میں نہیں آتا۔ ویسے وہ بڑا علم نواز تھا اور علم و ادب کی سرپرستی میں اپنے معاصرین سے کسی طرح کم نہ تھا[1]۔ مگر نجوم اور نجومیوں کے بارے میں بڑی بے اعتنائی برتتا تھا۔ عوفی نے «جوامع الحکایات» میں لکھا ہے:[2]

> «سلطان محمود بن سبکتگین انارالله برهانه کے دربار میں بیسوں ایسے مشہور و معروف منجم جمع تھے کہ اس زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے مگر سلطان کسی معاملے میں ان کی راے نہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی منہ لگے مصاحب نے دریافت کیا کہ علم نجوم کے اتنے بڑے بڑے استاد حضور کے پاس جمع ہیں مگر آپ کبھی ان سے کوئی بات نہیں پوچھتے۔ پھر ان کی موجودگی کا کیا فائدہ۔ سلطان نے جواب دیا . . . ملک میں ہر علم و فن کے ماہروں کی موجودگی ضرور ہے (مگر) . . . میرے معاملات کی بنیاد دو باتوں پر ہے: اول خدا پر توکل اور دوسرے شریعت کا فتوی»۔

(۱) و کان یمین الدولہ محمود بن سبکتگین عاقلاً دیناً خیراً عندہ علم و معرفۃ و صنف لہ کثیر من الکتب فی فنون العلم و قصدہ العلماء من اقطار البلاد و کان یکرمہم» ابن الاثیر: الکامل (۹ : ۳۹)

(۲) جوامع الحکایات (اردو ترجمہ) (۲ : ۱۰۷)

محمود نجوم بیزاری میں اتنا متشدد تھا کہ وہ ہیئت کو بھی الحاد و بیدینی سمجھتا تھا، چنانچہ یاقوت نے لکھا ہے :[1]

«انه ورد علیه رسول من اقصیٰ بلاد الترک و حدث بین یدیه بما شاهد فیما وراء البحر نحوالقطب الجنوبی من دورالشمس علیه ظاهرة فی کل دورها فوق الارض بحیث یبطل اللیل. فتسارع علیٰ عادته فی التشدد فی الدین الی نسبة الرجل الی الالحاد و القرمطة».

اسی نجوم بیزاری کا نتیجہ تھا کہ اس نے صحیح پیشین گوئی کرنے پر البیرونی کو بجائے انعام دینے کے بالا خانے پر سے پھنکوا دیا اور پھر قید خانہ بھیج دیا[2]. اگرچہ بعض لوگ اسے اس کی طفلانہ مزاجی کا نتیجہ سمجھ کر اس کی «گاهے بسلامے برنجند و گاهے بدشنامے خلعت دهند» سے تعبیر کرتے ہیں[3] اور بعض سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کرتے ہیں.

لیکن محمود کی یہ ساری نجوم بیزاری قرمطی سازشوں کے خلاف حزم و احتیاط کا نتیجہ تھی چنانچہ جب اس نے مجدالدولہ دیلمی کے خلاف رے پر فوج کشی کی تو جہاں باطنیوں کو سولی پر چڑھایا وہیں فلسفۂ و نجوم کی کتابوں کو جلوا ڈالا، البتہ دوسری کتابیں لدواکر وہ غزنی لے گیا. ابن الأثیر لکھتا ہے :[4]

«وصلب من اصحابه الباطنیة خلقاً کثیراً . . . و أحرق کتب الفلسفة و مذهب الاعتزال والنجوم و اخذ من الکتب ما سوی ذلک مائة حمل».[4]

ظاہر ہے ان ہمت شکن حالات میں محمود کی قلمرو کے اندر نجوم و ہیئت کو کیا ترقی ہوسکتی تھی، حالانکہ ہمسایہ ممالک ان علوم کی ترقی میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے تھے.

---

(۱) یاقوت: معجم الادبا (٦ : ١١٠)
(۲) چہار مقالہ (گب میموریل ایڈیشن) : ۵۷
(۳) تاریخ فرشتہ (۱: ۳۰۸)
(٤) ابن الأثیر : الکامل (٩ : ١٢٨)

۳۔ پھر جیسے ہی پانچویں صدی کے وسط میں سلاجقہ بر سراقتدار آئے ہیں، نجوم و ہیئت کا چرچا ختم ہوجاتا ہے۔ سلجوقی خاندان ترک تھا جسے نہ قدیم ایرانی ثقافت سے (جس میں نجوم و ہیئت کی سرپرستی بھی شامل تھی) کوئی دلچسپی تھی اور نہ ایران کی «احیائیت پسندہ تحریک سے (جس کا پروپگنڈا نجومی پیشین گوئی کے سہارے کیا جاتا تھا) کوئی تعلق تھا ملک شاہ سلجوقی نے ۴۶۷ھ میں رصد گاہ ضرور تعمیر کرائی مگر اس کا مقصد تحصیل خراج کے لیے نو روز کے تعین کی اصلاح کا تھا، چنانچہ ابن الأثیر اس سال کے واقعات میں لکھتا ہے[1]:

«و فیها جمع نظام الملک و السلطان ملک شاه جماعة من اعیان المنجمین و جعلوا النیروز اول نقطه من الحمل وکان النیروز قبل ذلک عند حلول الشمس نصف الحوت. وصار ما فعله السلطان مبدأ التقاویم و فیها أیضاً عمل الرصد للسلطان ملکشاه. . . و بقی الرصد دائراً الی ان مات السلطان سنة خمس و ثمانین واربعمائة فبطل بعد موته».

کارکن وہی لوگ تھے جو وہیں دور کے باقیات الصالحات تھے۔ ان کے بعد سوائے دو تین ناموں جیسے محمد بن احمد المعموری، بہاءالدین ابو محمد الخرقی، عبدالرحمن الخازنی (مصنف زیج سنجری) کے کسی اور ہیئت داں کا نام سننے میں نہیں آتا اور یہ نام بھی ہیئت کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے

اس عرصداشت سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علوم کے ارتقاء کی جہت تاریخی عوامل سے متعین ہوا کرتی ہے اور اس لیے کسی علم کی ترقی کو کماحقہ سمجھنے کے لیے اس کے سیاسی و اجتماعی پس منظر کو سامنے رکھنا اشد ضروری ہے۔

غالباً اس اعتذار کے بعد میری طول کلامی کو جو میں نے «البیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقا» میں اس کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے سلسلے میں اختیار کی تھی رنگین نوائی نہ سمجھا جائیگا۔ وہ اپنی

(۱) ابن الأثیر: الکامل (۱۰: ۳٤)

جگہ ضروری تھی اور اس کے بغیر علم المثلثات کا ارتقا واضح طور پر نظر کے سامنے نہیں آسکتا تھا.

(ب) پروفیسر صاحب کا ارشاد ہے: «عربوں کے ہاں علوم کی جو تصویر اُنھوں نے کھینچی ہے وہ گو رنگین و دلکش ضرور ہے. لیکن اپنے اصلی خد و خال سے مبرا ہے».

اگر پروفیسر صاحب کی مراد یہ ہے کہ میں اسلامی ثقافت کے شاندار ماضی کی کما حقه تصویر نہیں کھینچ سکا اور فضلائے اسلام نے علوم حکمیه کی جو شاندار خدمات انجام دی تھیں، میں انکے بیان واقعی سے قاصر رہا ہوں تو مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا اعتراف ہے. میرا مطالعه محدود تھا لیکن اگر اُن کا یہ خیال ہے کہ میں نے اس کے بیان میں مبالغه طرازی سے کام لیا ہے تو یه سوءظن ہے. میں نے مسلمانوں کے جس کمال کا ذکر کیا ہے اُس کے ثبوت میں مستند حوالے دیے ہیں. رہی اس کی رنگینی و دلکشی تو تاریخ ہمیشه افسانه سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے.

(ج) پروفیسر صاحب نے فرمایا ہے «اس خاکه کے کھینچنے میں بھی ان سے کئی جگه تسامح ہوا ہے» راقم الحروف کو اپنی اصابت پر اصرار نہیں ہے. مجھ سے ضرور تسامحات سرزد ہوئے ہونگے اور ہونے چاہئیں.

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام

البته میں نے جو کچھ لکھا ہے «مجلۂ علوم اسلامیه» کے دیگر مقاله نگاروں کی طرح پوری ذمه داری اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے. لہذا معروضات ذیل کا مقصد جناب قریشی صاحب کے اعتراضات کی تردید نہیں ہے صرف اپنے موقف کی توضیح ہے.

قریشی صاحب نے ان «تسامحات کی ایک طویل فہرست دی ہے جو مجھ سے سرزد ہوئے ہیں انکی تعداد ۲۴ ہے ذیل میں ان کے وہ اعتراضات اور ان کے جواب پیش کیے جاتے ہیں:

۱ـــ ایک درجه کے قوس کے وتر:

فاضل معترض کا فرمانا ہے «علم المثلثات کے جن مسائل پر فاضل

مضمون نگار نے بحث کی ہے . . . . ان مسائل کے مبادیات سے بھی عہدہ برا نہیں ہوسکے» (مجلہ : ١٤٢) یہ ممکن ہے مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہوں لیکن مبادیات ہوں یا مہمات مسائل کسی مسئلے کے پیش یا افادہ ہونے کا دعویٰ کرکے قدماء کی کاوشوں کا استخفاف نہیں کیا . مثلاً نصف درجہ کے قوس کا جیب یا ایک درجہ کے قوس کا وترکی دریافت آج ریاضی کے طالب علموں کے لیے کتنی ہی آسان کیوں نہ ہو مگر البیرونی کے زمانہ میں بلکہ نویں صدی ہجری تک مہمات مسائل میں سمجھی جاتی تھی . یہی نہیں بلکہ نویں صدی تک اس کا سائنٹفک حل دریافت نہیں ہوا تھا . قریشی صاحب مزید فرماتے ہیں :

« دائرے کے اندر منتظم کثیر الاضلاع اشکال کے ضلعے دریافت کیے گئے یعنی دائرے کا ثلث ، ربع ، خمس ، سدس ، تسع اور عشر . . . تسع اور عشر کے بالمقابل قوس ٤٠ اور ٣٦ درجوں کے برابر ہوتے ہیں ، ان دونوں قوسوں کا فرق ٤ ہوا جس کا وتر ایک خاص قاعدے سے دریافت کیا گیا اور پھر اس کے نصف قوس کا وتر اور پھر اس کا ربع یعنی ایک درجہ قوس کا وتر دریافت ہوا جو نصف درجہ کی قوس ٹھری »

٤٠ اور ٣٦ درجہ کی قوسوں کے فرق کا وتر اور اس کے چوتھائی یعنی ایک درجہ کے قوس کا وتر نکالنا مسلم ؔ بشرطیکہ ٤٠ درجہ قوس کا وتر معلوم ہو لیکن یہی تو چوتھی پانچویں صدیٰ میں بلکہ نویں صدی کے نصف اول تک علم المثلثات کے راستہ کا سنگ گراں تھا اور پیہم کوششوں کے باوجود دریافت نہیں ہوسکا چنانچہ البیرونی پہلے « مسبع منتظم » کے وتر کے بارے میں لکھتا ہے .

« هذا عالم يوجد إلى الأن من زمانا طريق الى استخراجه » .

اس کے بعد « متسع منتظم » (وتر التسع یا ٤٠ درجہ کے قوس کے وتر) کے وتر کی معرفت کے عسیر التحقیق ہونے کے بارے میں لکھتا ہے :

« حال وتر التسع كحال وتر السبع في خفاء الطريق الى معرفته . . .

(الا) ان الحاجة امس ماتکون وسیاتی للتالی له بالحیل ذکرفیمابعد »
اس کے بعد باب رابع میں جس کا عنوان « فی التحمل لاستخراج وترالتسع »
ھے ۔ لکھتا ھے :

« کمابعدت معرفة وتر ثلث القوس المعلومة الوتر کذلک بعدت معرفة وتر التسع »

اس کے بعد کہتا ھے : ولم یتات بتسبیع الدائرة الابتحریک الآلات واستعمال قطوع المخروط التی یقل غناؤ ھا فی الاعداد »

[کسی بے دائرہ کو نو برابر حصوں میں تقسیم نہیں کیا سوائے میکانکی طریقوں کے یا قصول مخروطیه کی مدد سے لیکن ان طریقوں سے حاصل شدہ تقسیم سے عددی حساب میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا] اسی طرح « رساله استخراج الاوتار» : ۱۰۵ ـ ۱۰۷ میں لکھتا ھے :

والی الآن لم یفتح لاحد طریق الی معرفة ثلث القوس المعلومة الوتر بالاطلاق و انما یحومون فی المطلوب حول الحق . . . . ولم تیات ذلک بالاصول الهندسیة لاحد الی زماننا هذا و اعیا الکل استخراجه الا بالحیل المقربة المحرفة عن طریق الهندسة کما اخرجه الکندی و القد ماء بالآلة و التحریک و استخرجه المحدثون لخواص القطع الزائد من قطوع المخروط »

یہ ناکامی نویں صدی کے نصف اول تک برقرار رہی کیونکہ الغ بیگ (المتوفی ۸۵۳ ھ) نے زیج میں لکھا ھے :

« وجیب یکدرجه که بناء عمل جدول جیب وظل برآن ست الی یومنا هذا هیچ کس بطریقے برهانی استخراج نه‌کرده و همه حکما تصریح کرده اند بآنک طریق علمی استخراج آن نیافته اند و حیلت‌کرده اند تا بتقریب بدست آورده اند. وماجنایت الله ومنه بطریقے برهانی ملهم شدیم و دربیان آن عملے کتابے پرداختیم وبآن جیب برهانی این جدول عمل کردیم »

اس سے زیادہ وضاحت سے اس کا حوالہ راجہ جے سنگھ سوائی نے

(جس نے تثلیث کے علاوہ تخمیس کا حل بھی دریافت کرلیا تھا)
«زیج محمد شاہی» میں دیا ہے:

«وغخفی نماند کہ شاہ مغفور و مبرور مرزا الغ بیگ چوں باستخراج جیب ثلث القوس معلومۃ الجیب موفق شدہ بود، باستعانت آں جیب یکدرجہ طریق برہانی استخراج کرد. اماچوں استعلام جیب یک دقیقہ موقوف بود برطریق یافتن جیب خمس قوس معلومۃ الجیب، استخراج جیب دقیقہ حیلہ استخراج فرمودہ در زیج وضع نمود. و ماحصل جہاں آفریں چوں باستخراج جیب خمس القوس معلومۃ الجیب را یافتیم، جیب یک دقیقہ راہم بطریق برہانی براوردہ درزیج ثبت کردیم»

غرض کم از کم البیرونی کے زمانہ تک متسع منتظم کا وتر یا بالفاظ دیگر ٤۰ درجہ کی قوس کا وتر بطریق برہانی (محض پٹری اور پرکار کی مدد سے) دریافت نہیں ہوا تھا، مگر فاضل معترض اتنے اہم مسئلہ کو اس طرح سرسری طور پر بیان فرماگیے ہیں گویا یہ ایک پیش پا اُفتادہ مسئلہ ہے۔

۲ — علم المثلثات کا آغاز:

«علم المثلثات کا آغاز ہیئتی جداول کی تیاری کے سلسلے میں ہوا تھا» اس پر تعقب فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: «یعنی ہیئتی جداول (جس سے ان کی مراد غالباً جیبی وظلی جداول وغیرہاہیں) مقدم ہیں اور مثلثات کا علم مؤخر. حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے» (مجلہ: ۱٤۳) جناب قریشی صاحب نے «ہیئتی جداول» کا مفہوم خود ہی «جیبی وظلی جداول» قرار دے لیا اور پھر میری معروض کو غلط معنی پہنا کر اعتراض فرمادیا جو لوگ اردو اصطلاح «جداول» نہ جانتے ہوں ان کے لیے میں نے اس کے ساتھ انگریزی اصطلاح (Astronomical Tables) بھی لکھدی تھی اور ریاضیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ (Mathematical Tables) اور چیز ہے اور (Astronomical Tables) قطعاً شئ دیگر، مقدم الذکر میں جیبی وظلی

جداول کے علاوہ لوغارثم وغیرہ کی بھی جدولیں ہوتی ہیں مگر اجرام فلکی کی اوضاع و حرکات کی کوئی جدول نہیں ہوتی۔ یہ جداول صرف ہیئت کی کتابوں میں ثبت ہوتی ہیں۔ ان کے لیے عربی اصطلاح «زیج» انگریزی اصطلاح (Astronomical Tables) اور اُردو اصطلاح «ہیئتی جداول» ہے۔ مثال کے لیے «زیج الغ بیگ» «زیج شاہجہانی» «زیج محمد شاہی» وغیرہ کو دیکھیے بہت قریبی مثال خود «قانون مسعودی» ہے، جس کے تیسرے مقالہ میں ریاضیاتی جداول میں سے صرف جیبی وظلی جدولیں ضرور ہیں۔ باقی ساری کتاب «ثوابت» کے اوضاع (طول و عرض)، سیارات کے حرکات خاصہ و وسطیہ اور دیگر مظاہر فلکی کی تقاویم پر مشتمل ہے۔

اگر جناب قریشی صاحب نے (Astronomical Tables) اور (Mathematical Tables) کے مصادیق میں امتیاز کرنے اور مقدم الذکر کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اُنہیں اس نکتہ چینی کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

(ب) میں نے عرض کیا تھا «قدیم زمانہ میں علم المثلثات المستویہ کا مقصد ایک درجہ کے قوس کے وتر کو دریافت کرنا تھا»۔ فاضل معترض کو اس پر نقض وارد کرنا تھا لہذا فرمایا: «اصل مقصد دائرے کے قوس کو محدود منضبط کرنا تھا ... اس لیے سب سے پہلے دائرے کے محیط و نصف قطر کی نسبت دریافت کی گئی»۔ کیا اچھا ہوتا اگر فاضل معترض محض قیاس آرائی کے بجاے ریاضیات بالخصوص ہندسہ کی تواریخ کی طرف رجوع فرمالیتے۔ ایک درجہ کے قوس کے وتر کی دریافت اور محیط و نصف قطر کی نسبت کا تعین دو مختلف عملی مسئلے تھے۔ اول الذکر کی اہمیت افادی ہے اور ثانی الذکر تشحیذ ذہنی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں بنیادی چیز یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں کا ریاضی و ہندسہ اور ہیئت و علم المثلثات یونانی ریاضی و ہیئت کا تسلسل ہے، اس لیے کسی بھی مسئلہ کے ارتقا کی تاریخ سے نیز اس کی ترقی میں مسلمان علما کی خدمات کے صحیح اندازہ سے واقفیت کے لیے اس کی یونانی

عہد کی تاریخ پر تفصیلی نظر ہونا انتہائی ضروری ہے ۔ لیکن عموماً مسئلہ کے اس پہلو کے ساتھ وہ اعتنا نہیں کیا جاتا جس کا وہ مستحق ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو عہد اسلام کی کاوشیں نظر انداز ہوجاتی ہیں یا پھر اغراق و مبالغہ کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں ۔

بہرحال دائرے اور قطر کی نسبت کی دریافت، یا دائرے کے برابر مربع ناپنے کی تشحید دہنی کے سلسلے میں قدیم ترین نام جسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے (Hippocrates) کا ہے ۔ اس کی « سطح ہلالی » (Lune) کی تربیع کی کوشش کا تذکرہ سمپلیقیوس نے « طبعیات ارسطو کی شرح » میں کیا ہے ۔ بعد میں اور یونانی حکما نے اس کوشش کو جاری رکھا ، جسکی تفصیل موجب تطویل ہوگی ۔

لیکن جہاں تک ایک درجہ کی قوس کے وتر کی دریافت کا تعلق ہے اسکی اہمیت اور اسکے ساتھ اعتنا و اہتمام اس سے قدیم تر ہے اس دریافت کے لیے « امہات اوتار » (Principal Chords) کی مقادیر دریافت کی گئی تھیں ۔ « اصول هندسه » پر لکھنے والے یونانی مصنفین (جن کے متقدمین کی صف میں (Hippocrates) کا نام لیا جاتا ہے ، نہ صرف « امہات اوتار » کی مقادیر سے واقف تھے ، بلکہ ان کے خواص پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ۔ چنانچہ اقلیدس نے جو (Hippocrates) سے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ متأخر نہیں ہے ۔ « امہات اوتار » بالخصوص دائرے کے خمس، عشر اور سدس کے اوتار کے خواص سے « مجسمات خمسه » (Five Regular Polyhydra) کے ناپنے میں مدد لی ہے ۔ مثلاً وہ چوتھے مقالہ کی پندرھویں شکل میں کہتا ہے کہ مسدس دائرہ کا وتر نصف قطر کے برابر ہوتا ہے ۔ یا مثلاً وہ اسی مقالے کی دسویں شکل میں اس مثلث متساوی‌الساقین کے ناپنے کا طریقہ بیان کرتا ہے ، جس میں قاعدے پر کا ہر ایک زاویہ ، زاویہ‌راس کا دگنا ہو ۔ یہ مسئلہ دائرے کی « تخمیس » میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس مثلث کو « مثلث المخمس » کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔ پھر وہ تیرھویں مقالہ کی

رھویں شکل میں کہتا ھے کہ ثلث دائرے کے وتر کا مربع نصف قطر
. مربع کا تین گنا ھوتا ھے . لیکن زیادہ دلچسپ اس مقالہ کی بارھویں
تیرھویں شکلیں ھیں . بارھویں شکل میں کہتا ھے کہ اگر دائرے کے
س اور عشر کے اوتار کو ایک سیدھ میں ملاکر رکھ دیا جائے تو
ل مجموع بنقطۂ اتصال پر « نسبت ذات وسط وطرفین» میں منقسم ھوجاتا ھے یا
$S^2_6=S_{10}$ $(S_6+S$ تیرھویں شکل میں کہتا ھےکہ خمس دائرہ کا مربع مسدس
رے کے مربع اور عشر دائرہ کے مربع کے مجموعہ کے برابر ھوتا ھے.
$S^2_5=S_6^2+S^2_{10}$

لیکن اقلیدس کی « اصول ھندسہ » صرف ھندسہ کی کتاب تھی اور
ں کا مقصد تالیف « مجسمات خمسہ » کے بنانے کے برھانی طرق کی
یافت تھا جو افلاطونی فلسفہ میں مخصوص اھمیت رکھتے ھیں . اسکے لیے
ں نے مخمس ، معشر اور مسدس کے اضلاع کے باھمی خواص سے بھی
ںد لی . لیکن اس مسئلہ پر باقاعدہ بحث بطلیموس (۸۷ - ۱۶۵ء) نے «المجسطی»
ں کی ، غالباً اس سے پہلے ارخس اور دیگر ھیئت‌دانوں نے بھی اپنی
نی تصانیف میں اسکے ساتھ اعتنا کیا ھوگا مگر انکی کتابیں بادحوادث
ی نذر ھوچکی ھیں .

بہر حال « المجسطی » کے پہلے مقالہ کا بیشتر حصہ ان « امہات اوتار »
ی دریافت پر مشتمل ھے . بالخصوص خمس دائرہ اور عشر دائرہ کے اوتار
ی قیمت پر : [الفصل‌العاشرفی مقادیرالاوتار - نبدء بضلعی المعشر و المخمس]
یکن اس طول عمل کا مقصد ایک درجہ کے قوس کے وترکی دریافت تھا
طلیموس نے $1\frac{1}{2}$ درجہ کے قوس کا وتر معلوم کیا پھر اسکے نصف $\frac{3}{4}$
درجہ کا وتر معلوم کیا اور پھر انکے موازنے سے ایک درجہ کا وتر
تقریبی طور پر دریافت کیا جو ثانیوں تک صحیح ھے .

چوتھی صدی ھجری میں یعقوب (غالباً ابو یعقوب) الیسنجری نے ۳
درجہ اور اسکے ربع $\frac{3}{4}$ درجہ کے اوتار کی ترکیب سے $3\frac{3}{4}$ درجہ کا
وتر دریافت کیا . بعد ازاں بقاعدہ تنصیف اسکے ربع یعنی $\frac{15}{16}$ درجہ کا

وتر معلوم کیا اور پھر اس میں اس کا $\frac{1}{15}$ جمع کر کے ایک درجہ کا وتر بزعم خویش معلوم کیا ۔ مگر البیرونی کہتا ہے :

« و ذلک وتر الجزء الواحد من غیر حاجة مـا زعم الی تطویل بطلیموس فیه . و ما احسن تلطف یعقوب لمرامه لولا افساده الخاتمة » .

لیکن البیرونی کی یہ تنقید اسکے « اصرار علی التحقیق » کی بنا پر ہے ورنہ بقول اسکے « تقریبی » حیثیت سے بطلیموس اور ابو یعقوب دونوں کے عمل میں کوئی فرق نہیں ۔ رہی یہ بات کہ بطلیموس اپنے عمل کی خامی سے واقف تھا اور ابو یعقوب اپنے عمل کی غلطی پر متنبہ نہ تھا تو یہ بات البیرونی کے زمانہ میں تھی جو کہتا تھا کہ قوس اور اس کے وتر کی تساوی غیر ممکن الوقوع ہے (و ذلک ان هذا التساوی غیر کائن فی الحقیقة) لیکن جدید ریاضیات اس شعور (بطلیموس) اور لاشعور (ابو یعقوب) کے امتیاز کو ختم کرچکی ہے اور موجودہ علم المثلثات کا مبادی مسئلہ یہ ہے کہ جیسے جیسے قوس کم ہوتی جاتی ہے قوس اور اس کی جیب ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں ۔ اس موضوع سے متعلق ٹاڈھنٹر (Todhunter) کی تصریحات ملاحظہ ہوں

۳ ۔ الشکل القطاع کے بدل ۔

میں نے عرض کیا تھا « الشکل القطاع ۔۔ یونانی ہیئت کی تاریخ میں بیر عرصہ تک مسلمان ہیئت دانوں میں بھی جب تک صاطلہ الجیوب (Sine Formulae) اور اسکے بدل دریافت نہیں ہوئے تھے تمام مثلثاتی حسابوں کی اصل سمجھی جاتی تھی »

قریشی صاحب نے اس پر تعقب فرمایا ہے ۔

« شکل مغنی ہی کا دوسرا نام صاطلہ جیوب (Sine Equation) ہے ۔ اس شکل کا کوئی بدل نہیں جیسا کہ فاضل مضمون نگار کا بیان ہے بلکہ یہی قانون ہیئت ہے » ۔

ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ میرے مافی الضمیر کے سمجھنے میں فاضل معترض نے غیر ضروری تعجیل سے کام لیا ہے ۔

(الف) کیونکہ میں نے وہی عرض کیا تھا جو محقق طوسی نے « شکل القطاع » (صفحہ ۸۸) میں اس شکل کے بارے میں لکھا ہے :

«ولم یزل قدماء علم الهندسة یعملون هذا الشکل فی هذه المطالب وعلیه یعتمدون ... اما المتأخرون ... استنبطوا اشکالاً تقوم مقام القطاع فی فوائده».

آگے چل کر وہ (محقق طوسی) صفحہ ۱۰۷ پر شکل قطاع کے دو « بدل » قائم مقام بتاتے ہیں :

« و للمتأخرین فی ذلک قانونان کلیان یعرف احدهما بالشکل المغنی عن القطاع فانه یقوم ... مقام الشکل القطاع ...والثانی یعرف بالشکل الظلی و هو ایضاً فی معظم المطالب یقوم مقام القطاع ... و یکون العمل به فی بعض المواضع اسهل من العمل بالمغنی و فی بعض بالضد » .

اس کے بعد اگر « شکل ظلیّ » یا « شکل نفی » کو ایک دوسرے کا بدل نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے ۔ غالباً اس سیدھی سادھی حقیقت کے لیے اسکے علاوہ اور کوئی انداز تعبیر نہیں ہے ۔

زیادہ بہتر ہوگا اگر فاضل معترض ریاضیات کے کسی پروفیسر سے اس معاملہ میں رجوع فرمائیں ۔ وہ بتائیں گے کہ آج بھی « شکل ظلی » « شکل مغنی » کے بدل کے طور پر مستعمل ہوتی ہے ۔ یہ « تعدیل الجیب » کی طرح « تعدیل تمام الجیب » (Cosine Equation) بھی علم المثلثات الکرویہ میں اساسی حیثیت رکھتی ہے ۔

(ب) « الخجندی نے اس شکل کا نام قانون الهیئت رکھا تھا » میری یہ معروض بھی محقق طوسی کی « شکل القطاع » ہی سے ماخوذ تھی : « وقد لقب ابو محمود الخجندی هذا الشکل بقانون الهیئة » ۔ (کتاب شکل القطاع صفحہ ۱۲۵) اور محقق طوسی کی یہ تصریح خود البیرونی کی «مقالید علم الهیئة» (ورق ۱۷۷ ب) سے ماخوذ ہے ۔

« ولقیت أبا محمود حامد بن محمد الخجندی وأخرج الیّ کتاباً ... أورد فی لواتله هذا الشکل ... سماه قانون الهیئة »[1] .

---

(۱) بحوالہ برهان (مئی سنہ ۱۹۵۵) صفحہ ۳۰۲

اسکے بعد فاضل معترض کا یہ تعجب ناقابل فہم ہے کہ « شکل منفی . . . کا کوئی بدل نہیں جیسا کہ فاضل مضمون نگار کا بیان ہے بلکہ یہی قانون ہیئت ہے » .

٤ ـ برہم سدھانت کے پہلے مترجم کا نام :

(الف) قریشی صاحب فرماتے ہیں : « برہم اسپٹھ سدھانت کے ترجمے کے بارے میں ابراھیم بن حبیب الفزاری کا تذکرہ ہے لیکن چند سطروں کے بعد یہ نام محمد بن ابراھیم بن حبیب الفزاری ہوگیا ہے » .

میں نے « برہم سدھانت » کے ترجمہ کے بارے میں کہیں ابراھیم بن حبیب الفزاری کا ذکر نہیں کیا . میرے مضمون میں اس ترجمہ کا تین مرتبہ ذکر آیا ہے اور ہر مرتبہ محمد بن ابراھیم الفزاری کو اس کا مترجم بتایا گیا ہے :

« محمد بن ابراھیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے ھندو ہیئت (سدھانت) کو عربی میں منتقل کیا » (مجلہ : ٢٦ ص ٢١-٢٢)

« پس محمد بن ابراھیم الفزاری نے اس کام (برہم سدھانت کےترجمہ) کو انجام دیا » (مجلہ : ٢٨ ص ١٩ ـ ٢٠)

« محمد بن ابراھیم الفزاری کی اس کتاب (ترجمہ برہم سدھانت) پر ماہرین ہیئت کا تیسری صدی کے آغاز تک عمل رہا » . (مجلہ ٢٨ ص ٢٣ ـ ٢٤) .

(ب) آگے چل کر فاضل معترض فرماتے ہیں : « فاضل مضمون نگار کو باپ اور بیٹے کے نام میں شاید اس لیے التباس ہوگیا ہے کہ . . . ابن القفطی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان دونوں فضلا کو ایک ہی سمجھ کر ان کے ناموں کے التباس میں دھوکا کھایا ہے . نلینو نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے . وہ آخر میں لکھتا ہے :

اس طویل بحث سے ہم اغلباً یہ نتیجہ نکالتے ہیں : اول فزاری سے مراد ایک ہی شخص ہے . . . دوسرے اس کا نام زیادہ قرین قیاس ابراھیم بن حبیب تھا نہ کہ محمد بن ابراھیم ... تیسرے یہ کہ ابن القفطی

نے اپنے مختلف مآخذ کی بنا پر ایک ہی شخص کو دو نام دے دیے ہیں » ۔

فاضل معترض نے مذکورالصدر تعقب محض اس بنا پر کیا ہے کہ میری رائے نلینو کی رائے سے مختلف تھی ، جبکہ انہوں نے اس پر غیر مشروط اعتماد کرلیا ہے نلینو میرے لیے واجب الاحترام محقق ہے مگر اس پر غیر مشروط اعتماد میری طالب علمانہ ذمہ داری کے منافی تھا ، کیونکہ اکثر مقامات پر میرے لیے اس کا حرفاً حرفاً تسلیم کرنا ناممکن ہوگیا تھا ۔ مثلاً علم المثلثات الکرویہ کی جو تاریخ نلینو نے دی ہے میں نے اسکے بجائے محقق طوسی کی « شکل القطاع » کا اتباع احوط سمجھا جو البیرونی کی « مقالید علم الهیئة » پر مبنی ہے ۔ نلینو پر غیر مشروط اعتماد البیرونی کی تکذیب کے مترادف تھا ۔ اس کی تفصیل یہ ہے :

« ضابطۂ جیوب » (شکل مغنی) کی دریافت کے شرف اولیت میں تو نزاع ہے کہ یہ ابو الوفاء کی دریافت ہے یا ابونصر بن عراق کی مگر « ضابطة الاظلال » بلا کسی اختلاف کے ابوالوفاء (۳۲۸-۳۸۸ھ) کی دریافت ہے جیسا کہ طوسی نے « مقالید علم الهیئة » سے نقل کیا ہے : « السبق فی استنباط هذا الشکل لابی الوفاء البوزجانی بلا تنازع من غیره علی ماذکره ابوریحان »[۱] لیکن نلینو کا کہنا ہے کہ اس ضابطہ کے استعمال میں حبش بن عبداللہ جو خلیفۂ مأمون اور معتصم کے زمانہ کا ہیئت داں ہے ، سبقت کر چکا تھا[۲] :

> « و فی اواخر القرن الثالث أو اوائل الرابع توصلت العرب الی معرفة کل هذه القواعد المختصة بالمثلثات الکرویة القائمة الزاویة ، اذ وجدتها مستعملة لحل مسائل علم الهیئة الکروی فی النسخة الخطیة الوحیدة من زیج احمد بن عبدالله المعروف بحبش الحاسب المحفوظة بمکتبة برلین .... فضلاً نصیر الدین المتوفی سنة ۶۷۲ / ۱۲۷۴ م فی نسب .

(۱) الشکل القطاع : ۱۲۶

(۲) علم الفلک تاریخه عند العرب ۲۴۸ ـ ۲۴۹

اختراع استعمال الاظلال لحل المثلثات الكروية القائمة الزاوية الی ابی الوفاء البوزجانی المتوفی سنة ۳۸۸ ھ » .

قریشی صاحب بھی نلینو کے اس « تخطیہ » سے ناواقف نہیں ھیں کیونکہ اورینٹل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰ ء) میں صفحہ ۵۹ پر فرماتے ھیں :

« اطالوی پروفیسر کارلو نلینو کے قول کے مطابق ان قواعد کا علم عربوں کو تیسری صدی کے اواخر یا چوتھی صدی ھجری کی ابتدا میں ھوچکا تھا کیونکہ ان کا استعمال ہرلین کے نسخۂ زیج احمد بن عبداللہ المعروف بحش الحاسب میں موجود ھے . اس لیے اس کا ادعا ہے کہ بقول محقق طوسی اس کی اولیت کا سہرا البیرونی کے اُستاد ابونصر علی بن عراق کے سر نہیں ھوسکتا » [1]

مگر یہ محض محقق طوسی کا تخطئہ نہیں ھے بلکہ یہ خود البیرونی کا تخطئہ ھے کیونکہ نلینو خود حاشیہ میں لکھتا ھے .

« کتاب الشکل القطاع المطبوع فی القسطنطینیة سنہ ۱۳۰۹ ص ۱۲٦ . واعتمد نصیر الدین فی قوله هذا علی ابی الریحان البیرونی المتوفی سنة ٤٤٠ ھ » .

اس کے بعد نلینو پر غیر مشروط اعتماد اور اُس کی تصویب مطلق اس بات کے مترادف ھوگی کہ نہ صرف البیرونی نے غلطی سے شکل ظلی کا شرف اولیت ابو الوفاء البوزجانی کو دیدیا ھے . بلکہ یہ کہ اس باب میں اُس نے جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لیا ھے کیونکہ حبش کی زیج کا البیرونی نے تحقیقی مطالعہ کیا تھا . یہی نہیں بلکہ اس کے مسائل کے دلائل بھی

(۱) یہاں فاضل معترض سے دو غلطیاں ھوئی ھیں : نلینو نے لکھا تھا کہ محقق طوسی نے ابوالوفاء البوزجانی کی طرف شکل ظلی کی اختراع کرکے غلطی کی ھے قریشی صاحب نے ابوالوفاء البوزجانی کے بجائے ابو نصر بن عراق کردیا . دوسرے یہ کہ ابو نصر بن عراق کا نام علی نہیں بلکہ « منصور » ھے . علی اس کے باپ کا نام ھے .

«تطلیل زیج حبش» کے عنوان سے مرتب کرلیے تھے جن کا وہ قانون مسعودی میں بار بار حوالہ دیتا ہے[1]۔

اس صورت حال کے بعد دو ہی شکلیں ہیں۔ یا تو پروفیسر نلینو کا آنکھ بند کر کے اتباع کیا جائے، جس کے معنی البیرونی کی تکذیب کے ہیں۔ مگر اس کے بعد وہ بنیاد ہی منہدم ہوئی جاتی ہے جس پر علمی تحقیقات کا قصر منیع تعمیر ہوا ہے، یا البیرونی اور دیگر قدیم مصادر کو درخور اعتنا سمجھا جائے اور جدید محققین پر مشروط اعتماد کیا جائے میں نے دوسری شکل اختیار کی ہے، چنانچہ جہاں قدیم مأخذ و مصادر سے نلینو یا دیگر مستشرقین کے افادات کی تائید ہوتی ہے اختلاف کی افادات کی تائید ہوتی ہے، اختلاف کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جہاں نہیں ہوتی وہاں قدیم مصادر و مآخذ ہی کا اتباع کرتا ہوں۔

نلینو نے اپنی کتاب علم الفلک تاریخه عندالعرب میں ابن القفطی پر بڑی شدید تنقید کی ہے۔ باایںہمه اس القفطی کی جلالت قدر اور اس کی کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، خود نلینو کو اقرار ہے که ابن القفطی کے تسامحات ناقابل اعتناء ہیں اور اپنی اس نکته چینی کی معذرت کرتا ہے[2]۔

کیا یہی اصول خود نلینو پر اعتماد کے باب میں ملحوظ نہیں رکھا جانا چاہیے که اس کی وسعت معلومات، وثوق روایت اور شدت اجتہاد کے

---

(۱) البیرونی نے «مقالید علم الهیئة» کے مقدمے میں لکھا ہے که ابوالوفاء نے سمت قبله کے طریق میں حبش الحاسب کے طریقه کے علاوه کوئی نئی بات نہیں کہی (برگ ۱۷۷ ظ) (بحواله برهان مئی ۱۹۵۵ء ص۳۰۲) لیکن نلینو کا دعویٰ ہے که شکل خفی اور شکل ظلی وغیره سب کی سب (کلّ هذه القواعد المختصة بالمثلثات الكروية القائمة الزاوية) حبش کو معلوم نہیں۔ فیا للعجب! کیونکه اگر ایسا ہوتا تو البیرونی ضرور اس کا ذکر کرتا، کتمان حق اُس سے بعید ہے۔

(۲) نلینو: علم الفلک تاریخه عندالعرب: ۶۱

باوجود اس سے استفادہ کرنے وقت ذمہ دارانہ طور پر بیدار مغزی و ہوش مندی اور ناقدانہ بصیرت کو کام میں لایا جائے غالباً اس سے اختلاف کے سلسلے میں میری یہ معذرت کافی ہوگی۔

جہاں تک محمد بن ابراھیم الفراری اور ابراہیم بن حبیب الفزاری کی شخصیتوں کے ایک یا دو ہونے کا تعلق ہے، تاریخی تنقید کے علاوہ افاضل مستشرقین کی تحقیق کو بھی میں اپنے سامنے رکھتا ہے اس سلسلے میں زخاؤ نے «کتاب الہند» کے انگریزی ترجمے کی تعلیقات میں اور فلپ حتی نے جو کچھ لکھا ہے دیکھا جائے[1] یہ دونوں مترجم کا نام محمد بن ابراهیم الفزاری بتاتے ہیں۔

بہر حال ملینو کے دعوے کی اساس محض قیاس ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں ایک محدث کا بھی یہی نام تھا (ابواسحاق محمد بن ابراھیم الفراری) اس لیے بعض مولفین نے غلطی سے ہیئت داں الفراری کا نام بھی محدث الفزاری کے نام پر محمد بن ابراہیم الفراری رکھدیا[۲]۔

ظاہر ہے اتنا سا بے بنیاد احتمال مصنفین سابقین کی تقلید و تخطیہ کے لیے کافی نہیں ہے اسی طرح جو کچھ اس نے مسعودی سے نقل کیا ہے قرائن اس کی تضعیف کرتے ہیں کیونکہ مسعودی جس الفراری کا ذکر کرتا ہے، وہ خود نلینو کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۷۲ کے بعد کا ہے۔ اس لیے وہ اس «الفزاری» کا عین نہیں ہوسکتا جس نے اکتیس سال قبل بناء بغداد کی نگرانی کی تھی۔ اس واضح الیعقوبی لکھتا ہے[۳]:

«خبر بهذا جماعة من المشائخ أن المنصور... اختطها (بغداد) فی شهر ربیع الاول سنة احدی واربعین ومائة و وضع اساس المدینة فی وقت اختاره نوبخت المنجم و ماشاء الله بن ساریة... وكان الذین هندسوها... بحضرة نوبخت و ابراهیم بن محمد الفزاری والطبری المنجمین اصحاب الحساب»

(۱) Albiruni's India Vol. ii, p. 310.

(۲) علم الفلک : ۱۵۹

(۳) البلدان : ۲۳۸

ظاہر ہے جن لوگوں کو بنساء بغداد کی نگرانی جیسا اہم کام تفویض کیا گیا ہوگا وہ یقیناً پختہ کار اور عمر رسیدہ ہونگے ۔ چنانچہ نو بخت منصور کی زندگی ہی میں ۱۵۸ ھ سے قبل بوڑھا ہوکر کار ہائے مفوضہ کی انجام دہی سے عاجز ہوگیا تھا اور اس کی پیرانہ سالی کی بنا پر منصور نے اس کے بیٹے کو منجم باشی بنایا تھا ۔ لہذا نوبخت کے ساتھی افزاری کے بارے میں کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیس چالیس سال اور زندہ رہا ہوگا اور دور دراز صوبوں کی مساحت و مسافت کو دریافت کرکے قلمبند کیا ہوگا ۔

اس لیے صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح نوبخت کے ضعیف ہوجانے پر اس کا بیٹا ابوسہل منصور کا خصوصی جوتشی مقرر ہوا اس طرح ابراہیم بن حبیب الفزاری کے بعد جو ۱۴۱ ھ میں ہی کافی بوڑھا رہا ہوگا، محمد بن ابراہیم الفزاری اس کی جگہ دربار کا خصوصی ہیئت داں مقرر ہوا اور ۱۵۶ ھ میں برہم سدھانت کے ترجمہ پر مامور ہوا اور جس طرح نوبخت کا بیٹا ابوسہل بن نوبخت بساء بغداد کے تیس چالیس سال بعد ہارون الرشید کے « خزانة الحکمة » کا لائبریرین مقرر ہوتا ہے ، اسی طرح باپ کی بساء بغداد کی نگرانی کے تیس چالیس سال بعد محمد بن ابرہیم الفزاری عالم اسلامی کا جغرافیہ مرتب کرتا ہے ۔

اس استدلال سے قطع نظر مصنفین سابقین کی تصریحات سے بھی ابن القفطی کے قول کی تائید ہوتی ہے ۔ ان میں سے یاقوت حموی (صاحب معجم البلدان) اور صلاح الدین صفوی (صاحب الوافی بالوفیات) نسبتاً متأخر ہیں ۔ لیکن البیرونی (۳۶۰-۴۴۰ ھ) اور قاضی صاعد اندلسی (المتوفی ۴۶۲ ھ) تو متقدمین میں سے ہیں ۔ قاضی صاعد اندلسی (جو ابن القفطی کا ماخذ ہے) «طبقات الامم» (ص ۷۸) میں لکھتا ہے : «واما علم النجوم فاول من عنیٰ به فی هذه الدولة محمد بن ابراهیم الفزاری» اس کے بعد هندستانی وفد کا قصہ لکھتا ہے پھر کہتا ہے : «فتولی ذلک محمد بن ابراهیم الفزاری و عمل منه کتاباً یسمیه المنجمون بالسند هند الکبیر».

اسی طرح البیرونی «استخراج الاوتار» (ص ۱۲) میں جو ۴۲۷ھ سے قبل تصنیف ہوچکی تھی، لکھتا ہے: «فی حل التعدیل حساب آوردہ محمد بن ابراہیم الفزاری فی زیج السند ہند» ان شواہد کے بعد جنہیں نظر انداز کرنے کی صورت میں عہد اسلام کی علوم حکمیہ کی تاریخ مرتب کرنے کی کوئی اساس ہی باقی نہیں رہتی، تلیو کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جاسکتا محمد بن ابراہیم الفزاری اور ابراہیم بن حبیب الفزاری قطعاً دو مختلف شخصیتیں ہیں۔

۵۔ اسلامی تاریخ میں مساحت و ہندسہ کا آغاز:

فاضل معترض کا فرمانا ہے «اس زمانہ میں علم مساحت کا آغاز ہو تو ہو لیکن علم المثلثات تو ابھی مسلمانوں سے کوسوں دور تھا»۔

(الف) لیکن میں نے کبھی یہ نہیں لکھا کہ عہد فاروقی میں «علم المثلثات» کا چرچا تھا علم المثلثات کے لیے ہندسہ اور ہیئت کا ایک خاص درجہ مطلوب ہے اور صدر اسلام میں یہ مفقود تھا۔ اس لیے میں ایسا بے بنیاد دعوی تو نہیں کرسکتا تھا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندسہ و ہیئت دونوں کے جرثومے ظہور میں آچکے تھے۔ ہیئت کے لیے قرآن و حدیث نے تشجیع کی تھی اور ہندسہ کی بنیاد مساحت کے ضمن میں عہد فاروقی کے اندر پڑی میرے خیال میں علم المثلثات کے آغاز و ارتقاء سے پیشتر اُس کی ہندسی بنیاد (مساحت) سے تعرض ضروری تھا۔ رہا مساحت کے ذکر سے علم المثلثات کا شبہ تو یہ فاضل تعقب نگار کی تعجیل فرمائی ہے۔

(ب) قریشی صاحب کا یہ تردد کہ «اس زمانہ میں علم مساحت کا آغاز ہو تو ہو» بے بنیاد ہے۔ البلاذری نے «فتوح البلدان» (ص ۲۲۷) میں لکھا ہے: «حدثنی القاسم بن سلام ... عن الشعبی ان عمر بن الخطاب بعث عثمان بن حنیف الانصاری یمسح السواد، فوجدہ ستة و ثلاثین الف الف جریب»۔

دوسری جگہ (ص ۲۷۸) میں لکھا ہے: «حدثنا القاسم بن سلام

ان عمر بن الخطاب بعث عمار بن یاسر علی صلاة اهل الکوفة و جیوشهم و عبدالله بن مسعود علی قضائهم و بیت مالهم و عثمان بن حنیف علی مساحة الارض . . . فمسح عثمان بن حنیف الارض»

اسی طرح الماوردی نے «احکام السلطانیه» میں لکھا ھے: «وضرب عمر رضی الله عنه علی ناحیة أخری غیرها غیر هذا القدر. واستعمل عثمان بن حنیف علیه و امره بالمساحة و وضع ما تحتمله الارض من خراجها فمسح ووضع علی کل جریب من الکرم والشجر الملتف عشرة دراهم». (احکام السلطانیه ص ۱۳۲-۱۳۳)

۶—ایرالوستهیس:

فاضل معترض کا فرمانا ھے: «کس قدر تعجب کا مقام ھے که تذکره نویس مشهور یونانی جغرافیه دان کا نام ایرالوستهیس لکھتا ھے حالانکه اس کی معرب شکل اراتستاس عربوں کے ھاں عام طور پر مستعمل ھے».

لیکن یه اتنا اهم مسئله تو نه تھا جس کے لیے اس درجه خفگی کا اظہار یا استبعاد فرمایا جائے کیونکه اگر «عربوں کے ھاں» سے ان کی مراد عهد حاضر کے عربوں کی تصانیف ھیں تو واجب التقلید نہیں.

لیکن اگر قدیم عرب مصنفین سے مراد ھے تو اُن کے یہاں بھی اس کا کوئی مستقل املا نہیں تھا. خود البیرونی کے یہاں فاضل معترض کے بیان کے مطابق یه املا «اراتستاس» ھے اور «قانون مسعودی» (جلد ثانی ص ۵۲۸) میں یه «اراطشتانوس» ھے بہرحال اردو کے ادیب وملفاء اسے «ایرالوستهنیس» ھی لکھتے ھیں جس طرح وہ «جارج» (George) کو «جرجی» نہیں لکھتے.

۷ـ تربیع الدائره کی تحریف:

فاضل معترض کا فرمانا ھے: «بنو موسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے ریاضی کے تین بڑے مسائل: تربیع الدائره، تضعیف المکعب اور تثلیث الزاویه کی طرف اشارہ ھے: اس میں اول غالباً تسبیع الدائره (Inscription of a regular heptagon in a circle) سے مراد ھے». مجھے اندیشه ھے که فاضل

معترض نے یہاں تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے کیونکہ اگر وہ (Duplication of a Cube) کے عربی مترادف «تضعیف المکعب» کو بلا تکلف استعمال کر سکتے ہیں (حالانکہ میرے مضمون میں صرف انگریزی اصطلاح ہی تھی ۔ اس کا عربی مترادف رہ گیا تھا) تو یہ نہ ممکن ہے کہ وہ «تربیع الدائرہ» سے واقف ہوں اور اگر بفرض محال وہ اس اردو اصطلاح واقف نہ بھی ہو تو انگریزی اصطلاح (Quadrature of a Circle) سے تو ضرور واقف ہونا چاہیے ۔ ریاضیات کے معمولی طالب علم بھی عہد قدیم «مسائل ثلثہ» کے ضمن میں اسے جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر انھوں نے اسے میری یا کمپوزیٹر کی غلطی سمجھ لیا اور «تسبیع الدائرہ» سے اس کی اصلاح فرمادی ۔ حالانکہ دائرے کے سات برابر حصوں میں تقسیم یا دائرہ میں منتظم مسبّع کے کھینچنے کا عہد قدیم کے ان «مسائل ثلثہ» سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے ۔

۸ ۔ کتب علم الانواء :

فاضل معترض کا فرمانا ہے : «علم الانواء پر ملینو نے . . . کوئی ۲۲ ادیبوں کا ذکر کیا ہے . . . ان ۲۲ ناموں میں سے نہ تغیر و تبدل ہمارے فاضل مضمون نگار نے ۲۱ کا تو ذکر کیا ہے ۔ لیکن قطرب النحوی کو نہ معلوم کس بنا پر وہ حذف کر گئے ہیں ابوالقاسم عبدالرحمن بن اسحق الزجاجی کو صدف الزجاج لکھا ہے اور الاخفش الاصغر کی الاخفش الصغیر سے اصلاح کی ہے» ۔

اس عجیب نقد کا منشاء محدود مطالعہ ہے ۔ ملینو سے پہلے اور فضلاء نے بھی «کتاب الانواء» کے لکھنے والوں کی فہرست دی ہے ان میں حاجی خلیفہ کی «کشف الظنون» (مطبوعہ مطبع عالم) میرے پیش نظر تھی ۔ اس کی جلد ثانی ص ۲۹۶ پر «کتاب الانواء» کے زیر عنوان اس موضوع کے مصنفین کی ایک فہرست دی ہے ۔ میں نے اسی کو بنیاد بنایا تھا ۔ اس کے علاوہ ابن الندیم نے «الفہرست» (مصری ایڈیشن) کے ص ۱۳۰ پر «تسمیۃ الکتب المؤلفۃ فی الانواء» کے زیر عنوان ایک

اور فہرست دی ہے، میں نے اس سے بھی استفادہ کیا تھا. اس کے علاوہ بعض مصنفین کے نام «الفہرست» مقالہ هفتم[1] اور «عیون الانباء فی طبقات الاطباء»[2] سے بھی لیے تھے. لیکن چونکہ میں بالاختصاص اسی مبحث (کتب انواء) پر نہیں لکھ رہا تھا. اس لیے مصادر کا نام دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ استقصاء ہی کی کوشش کی گئی. جہاں اصل مصادر و مآخذ سے مراجعہ ممکن ہو وہاں معاصرین کی خوشہ چینی قطعاً غیر ضروری ہے.

الف ـــ «قطرب النحوی» کا نام چونکہ «کشف الظنون» کی دی ہوئی فہرست میں نہیں تھا، اس لیے نہیں لکھا گیا اور پھر استقصاء بھی منظور نہیں تھا.

ب ـــ کشف الظنون میں ابوالقاسم عبدالرحمن بن اسحاق الزجاجی کا نام نہیں ہے، بلکہ «ابواسحاق ابراهیم بن محمد الزجاج النحوی المتوفی ۳۱۰ عشرہ وثلثمائة» کا نام ہے. الفہرست لابن الندیم میں بھی «کتاب الانواء للزجاج» ہے. اس لیے «الزجاج» کے بجائے «ابوالقاسم عبدالرحمن بن اسحاق الزجاجی» لکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی. بالخصوص جبکہ نلینو کی کتاب کا یہ حصہ میرے پیش نظر نہ تھا.

ج ـــ الاخفش کے نام میں یہ عاجز کسی طرح اصلاح کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا. میں تو قدیم مصنفین کا متبع ہوں. ابن الندیم نے «الفہرست» (مصری ایڈیشن. ص ۱۲۳) میں لکھا ہے: «الاخفش الصغیر: ابوالحسن علی بن سلیمان الاخفش النحوی . . . ولہ من الکتب کتاب الانواء» ابن الندیم کی تصریح پر میں کیونکر قلم اصلاح پھیر سکتا تھا.

۹ـ ایک عجیب تعقب:

فاضل معترض نے فرمایا ہے: «یہاں یہ بات قابل ذکر ہے معارف فاضل نے بطور ماخذ نلینو کا ذکر تک نہیں کیا» میں نے کسی ایسے ماخذ

(۱) الفہرست (مصری ایڈیشن) ۲۸۵: الحسن بن سہل بن نوبخت وله من الکتب، کتاب الانواء.

(۲) طبقات الاطباء (۱: ۲۲): «کتاب فی الانواء» لثابت بن قرة.

کا ذکر کرنا جس سے استفادہ نہ کیا ہو، ادعائیت و مشیخت طرازی کے مترادف سمجھا۔ اس لیے ملینو کا اس مقلم پر حوالہ دینے کا کوئی عل نہ تھا جہاں اس سے استفادہ کیا ھے اس کا اعتراف ضرور کیا ھے مثلاً صفحہ ۲۵ (مجلۃ علوم اسلامیہ جون ۱۹۶۱ء) سطر ۷ پر اس سے استفادے کا ذکر ھے لیکن اگر اس نکتہ چیں سے ان کی مراد سرقہ کا الزام ھے تو یہ بدگمانی قطعاً بے بنیاد ھے۔ اس قسم کی الزام تراشی سے پیشتر ذمہ دارانہ طور پر تحقیق کرلینا چاھیے تھی۔ اس قسم کے معاملات میں اتنی عجلت کرنا ذمہ داری کے منافی ھے۔

ان کی تعجیل پسندی کا یہ عالم ھے کہ فرماتے ھیں: «ان ۲۲ ناموں میں سے بہ تغیر و تبدل ہمارے فاضل مضمون نگار نے ۲۱ کا تو ذکر کیا ھے» حالانکہ میں نے ۲۳ ناموں کا ذکر کیا ھے۔ ۲۲ کا صفحہ ٤٤ پر اور ایک (ابن قتیبہ) کا صفحہ ۲۷ پر میری فہرست میں ملینو کے مقابلہ میں کئی نام زیادہ ھیں۔

۱۰۔ ظل یا مماس:

فاضل مضمون نگار فرماتے ھیں۔ «عربوں کی عام متداول اصطلاح ظل اور ظل تمام کو یورپ کے تتبع میں مماس التمام سے تعبیر کیا ھے»۔

«مماس» اور «مماس التمام» کی اصطلاحیں مولوی ذکاءاللہ خاں کے زمانہ سے اردو میں متداول ھیں۔ پھر مماس (Tangent) اور مماس التمام (Cotangent) کے پیچھے ایک عملی تاریخ ھے جس کی تفصیل ریاضیات کی تواریخ میں ملیگی اس کے بعد ظل کی دقیانوسی اصطلاح پر اصرار رجعت پسندی کے مترادف ہوگا۔ قرون وسطی میں ان دونوں اصطلاحوں کا جو بھی مصرف رھا ہو مگر آج یہ مصرف محض «سایہ پیمائی» نہیں ھے، بلکہ مثلث اور دائرے کے مختلف اجزاء کی نسبت کا تعین ھے۔ جس طرح قوس کو اس کے نصف وتر اور دائرے کے نصف قطر کی نسبت سے جانچا جاتا ھے جو «اُس قوس یا اُس کے بالمقابل زاویے کی جیب کہلاتی ھے»۔ اسی طرح دیگر اجزاء اور «نصف قطر» کی نسبت کو ناپا جاتا ھے

کام « اظلال » سے نہیں چل سکتا کیونکہ اس میں نصف قطر اُصولاً داخل
ں ہوتا۔ اس لیے اس نسبت کو دوسری کسر سے ظاہر کیا جاتا ہے
ں میں نسب نما « نصف قطر » ہوتا ہے اور اس لیے شمار کنندہ دائرے
ے « مماس » کا ایک محدود جز ہوتا ہے اس لیے فطرتاً اس کے لیے
ﻄلاح « مماس » اور اس کے ساتھی کے لیے « مماس التمام » ہوگی۔

۱۔ ان العلماء یعلمون و لا یُعلمون:

فاضل معترض نے اس عاجز پر نکتہ چینی فرمائی ہے : «قاضی صاعد حوالہ دیتے ہوئے معتضد اور ثابت بن قرہ کا ہاتھ کھینچ لینے کا قصہ یان ہوا ہے اور ان العلماء یعلمون کا فقرہ معتضد کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ اس کے الفاظ بقول یاقوت حموی یہ ہیں « العلم یعلو ولا یعلیٰ » ۔

محترم نے کچھ اس وثوق کے ساتھ یاقوت کے یہ الفاظ دہرائے ہیں گویا وہ اُس موقعہ پر موجود تھا جب معتضد باللہ نے ہاتھ جھٹکا تھا جس سے ثابت بن قرہ گھبرایا تھا اور معتضد نے اس کی تشفی کی تھی۔ جو کچھ میں نے ابن ابی اُصیبعہ سے نقل کیا ہے یا فاضل معترض نے یاقوت سے نقل کیا ہے، ماحصل دونوں کا ایک ہے بظاہر دونوں تعبیروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح کی کوئی داخلی وجہ نہیں ہے۔ مگر چونکہ یاقوت کا «معجم الادباء» محض ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے فضلاء کا ذکر اسی صورت میں آیا ہے جبکہ وہ ادیب بھی ہوتے تھے۔ اصالتاً یہ حکماء فلاسفہ کا تذکرہ نہیں ہے نیز یاقوت نے اس قصہ کی طرف ضمناً اشارہ کیا ہے۔ ورنہ اس کا مقصود معتضد کے حضور میں ثابت بن قرہ کی جلالت قدر کا اظہار نہ تھا، بلکہ اس قدیم واقعہ کو وہ مثال کے طور پر پیش کرتا ہے اور مثال کی جزئیات میں مطابقت واقعہ کا اس درجہ التزام ملحوظ نہیں رکھا جاتا جتنا نفس واقعہ کی روایت و حکایت میں رکھا جاتا ہے۔ اس لیے اصولی طور پر اس تذکرے کی روایت مرجع ہوگی جو حکماء و اطباء کے حالات میں مرتب کیا گیا ہوگا جس

زمرہ سے ثابت بن قرہ کا تعلق تھا، اور جس میں اصل مقصود معتضد کے یہاں ثابت بن قرہ کے علومقام کا ذکر ہوگا۔

یہ تذکرہ ابن ابی اصیبعہ کا «عیون الانباء فی طبقات الاطباء» ہے مصنف نے یہ روایت براہ راست ابو اسحاق صابی سے کی ہے جو اس واقعہ کا ہم عصر ہے[1]۔

۱۲۔ ابو جعفر الخازن اور مساحت مثلث کے ضابطہ کا ثبوت:

فاضل معترض کا فرمانا ہے۔ «ابو جعفر الخازن کے زیر عنوان اس کی مساحت مثلث کا ذکر اس کی کتاب «مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ کے ضمیمہ کے حوالے سے دیا ہے طوسی کے بو رسائل کے مجموعے میں راقم الحروف کو اس ضمیمہ کا پتا نہیں چل سکا»

یہ میرے اوپر بہتان ہے کہ میں نے ابو جعفر الخازن کی کوئی تصنیف «مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» بتائی تھی میرے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ «ابو جعفر الخازن نے معلومۃ الاضلاع مثلث کا رقبہ دریافت کرنے کے مشہور ضابطہ کا ثبوت بھی دیا تھا جسے دائرۃ المعارف حیدر آباد نے بنو موسیٰ کی «مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» کے ضمیمہ میں شائع کردیا ہے»۔

خدا معلوم فاضل معترض نے کس طرح «بنو موسیٰ کی مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» کو اس کی (ابو جعفر الخازن کی) مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ»

(۱) وہ لکھتا ہے: «قال ابو اسحاق الصابی الکاتب ان ثابتاً کان یمشی مع المعتضد فی الفردوس و هو بستان فی دار الخلیفۃ الریاضۃ وکان المعتضد قد اتکأ علی ید ثابت و هما یتماشیان. ثم نتر المعتضد یده من ید ثابت بشدة ففزع ثابت فان المعتضد کان مہیباً جداً فلما نتر یده من ید ثابت قال له یا ابا الحسن و کان فی الخلوات یکنیه و فی الملاء یسمیه سهوت و وضعت یدی علی یدک و استندت علیها و لیس هکذا یجب ان یکون فان العلماء یعلون ولا یعلون»۔ طبقات الاطباء ۱: ۲۱۶

سمجھ لیا۔ میرے معروضہ سے تو کسی طرح بھی یہ معنی نہیں نکل سکتے۔ گو فاضل معترض نے «رسائل طوسی» کا اطمینان سے مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں یہ ضمیمہ ضرور مل جاتا «رسائل طوسی» (جلد ثانی) کا پہلا ہی رسالہ بنو موسیٰ کی «مساحۃ اشکال الکریہ والبسیطہ» ہے۔

۱۳۔ابو نصر بن عراق اور ابو جعفر الخازن:

فاضل معترض نے فرمایا ہے: «کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ فاضل مضمون نگار نے ابو نصر منصور بن علی بن عراق . . . کی ابو جعفر الخازن کے متعلق اپنی اس رائے کا اظہار کس بنا پر نہیں کیا . . . یہ عبارت کیوں حذف کردی . . . یہ سراسر فضلا کے طریق روایت اور دیانت کے خلاف ہے»۔

مجھے افسوس ہے کہ فاضل نکتہ چیں موضوع زیر بحث کو بھی فراموش کرگئے۔ موضوع زیر بحث «ابوجعفر الخازن کا تنقیدی مطالعہ» نہ تھا بلکہ «البیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقا» تھا اور اس مختصر جائزے میں صرف عظماء فن اور ان کی عظمت کو بیان کرنا مقصود تھا۔ اگر محض ابو جعفر الخازن کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہوتا اور اس میں اس کے «مسالہ» کے ساتھ اس کے «مساعیہ» کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک ناقص تذکرہ کہہ سکتے تھے یا اسے بددیانتی بتاسکتے تھے۔

پھر میرے مقالہ کا اصل مقصد علم المثلثات کے اندر اس کے مختلف ماہرین کی کاوشوں کا تذکرہ تھا اگر ان کاوشوں کو ان کے دریافت کنندگان کے بجائے کسی دوسرے کی جانب منسوب کردیا جاتا تو بےشک راقم پر بددیانتی کا الزام صحیح ہوتا کیوں کہ اس سے اصل موضوع کے ارتقا کا غلط نقشہ سامنے آتا ہے۔ لیکن اگر کسی معاصر نے دوسرے معاصر پر حریفانہ چوٹیں کی ہیں تو اُن کے ترک ذکر سے اصل موضوع کے ارتقا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بددیانتی اس وقت ہوتی ہے جبکہ کسی عبارت کے ضروری حصوں کے حذف سے مطلب کچھ کا کچھ ہوجائے۔ اس کی مثال الطوسی اعتراض میں آرہی ہے۔

١٤—تمہید المستقر فی معانی المعر

جناب معترض نے فرمایا ھے : « یہاں فاضل مضمون نگار سے لغزش ہوگئی ھے کہ انہوں نے البیرونی کی کتاب کا نام «تمہیدالمستقرفی معانی المعر» بتایا ھے حالانکہ صحیح نام «تمہیدالمستقر لتحقیق معنی المعر» ھے ۔

مجھے اپنی لغزشوں کا جناب معترض کی نشاندھی سے پہلے ھی اعتراف ھے مگر الفاظ کے بیجا اسراف سے پہلے اُبھیر مسئلہ کی اہمیت کو متحقق کرلیا تھا کیا ان دونوں میں اتنا بڑا فرق ھے کہ ان کے موضوع کے متعلق قاری کو غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ھے ؟ یقیناً نہیں، کیونکہ « معر » ہو یا اور کوئی لفظ اس کے « معنی کی تحقیق » کے لیے اس کے مروجہ « معانی » کا ذکر ضروری ھے ۔ اسی طرح کسی لفظ کے متعدد « معانی » میں سے اُس کے حقیقی مصداق کے تعین کے لیے اس کے « معنی » کی تحقیق بھی ضروری ھے ۔ یہ ایک سیدھی سادی بات ھے جس کے لیے دوسرے کو لغزش کا مرتکب بتانا الفاظ کا بیجا استعمال ھے ۔

بہر حال جناب قریشی صاحب کا تکیہ اس باب میں زخاؤ پر ھے ۔ اس نے « الآثارالباقیہ » کے مقدمہ میں البیرونی کا وہ خط نقل کیا ھے جس میں اس نے سنہ ٤٢٧ھ میں اپنے کسی دوست کو اپنی کتابوں کی تفصیل لکھکر بھیجی تھی ۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام زخاؤ نے « تمہید المستقر لتحقیق معنی المعر » لکھا ھے جو تقریباً ٦٠ ورق پر مشتمل تھی خدا جانے یہ خط کتنے واسطوں سے نقل ہوتا ہوا اس شکل میں آیا ھے جو زخاؤ کو ملا اور چونکہ روایت بالمعنی حدیث تک میں شائع تھی تو خدا ھی جانے کن کن کانوں نے اس « خط » میں کیا کیا جائز و ناجائز تصرفات کیے اور پھر زخاؤ بھی تو « معصوم عن الخطأ» نہیں ھے آخر علی بن رَبَّن (براے مہملہ) الطبری کو بھی تو اس نے علی بن زین (بزائے ہوز و یائے حطی) پڑھا ھے ، اور بھی اس سے تسامحات ہوے ہیں (جن کی تفصیل آگے آرھی ھے) . سخاؤ کا یہ کارنامہ ھی کیا کم ھے کہ اس کی اعتنا سے « الآثار الباقیہ » اور « کتاب الهند » جیسی اہم کتابیں چھپ کر عام دسترس

میں آگئیں. اس سے زیادہ کی اس سے توقع خوش فہمی ہے.« تمہید المستقر» دنیا سے ناپید نہیں ہے. اس کا (غالباً) واحد نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور میں موجود ہے.

بعد میں اس رسالہ کو البیرونی کے دوسرے رسالوں کے ساتھ « مجموعۂ رسائل البیرونی » کے نام سے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کردیا ہے. اپریل ۱۹۵۰ کے « اسلامک کلچر » میں اس مجموعہ پر تبصرہ شائع ہوا ہے. اس میں بھی اس رسالہ کا نام « تمہید المستقر فی معانی الممر » ہے. پھر اس کا افتتاح جس انداز میں ہوتا ہے اس سے بھی اس کا نام « تمہید المستقر فی معانی الممر » ہی مناسب معلوم ہوتا ہے. بہرحال یہ رسالہ میرے پیش نظر تھا.

لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ سیاق و سباق میں کہیں میری معروض سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ میں رحاؤ کے نقل کیے ہوئے البیرونی کے خط سے اس کی اس کتاب کا نام دے رہا ہوں. اس صورت میں میرا یہ تسامح بیشک « لغزش » کہلانے کا مستحق تھا میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع شدہ ایک کتاب سے[1] کوشیار کے ذکر کا حوالہ دے رہا ہوں کیا میرا یہ فرض نہ تھا کہ اس کے سرورق پر جو اس کا عنوان تحریر ہے، اُسے بعینہ نقل کردوں. یا مجھے یہ حق تھا کہ اس عنوان میں حسب دلخواہ تصرف کرلوں. عالم یہ ہے کہ صحیح نام لکھنے پر تو محققین عظام اُسے کچھ کا کچھ پڑھ ڈالتے ہیں جیسا کہ بو موسیٰ کی « مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ » کی گت بنی. اگر میں ہی اس میں غلط یا صحیح تصرف کر دیتا تو صحت نقل کی ذمہداری سے قطع نظر، اس کی افادیت کا حشر معلوم.

۱۵ـــ البیرونی اور گردش ارضی کا نظریہ:

فاضل معترض فرماتے ہیں: « انہوں نے ترجمہ ایسی خوبی سے پیش کیا ہے کہ سماء کی حرکت کلی کو بیرونی کے نزدیک در حقیقت زمین کی حرکت تسلیم کیا ہے حالانکہ وہ اسے شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے »

(۱) مجموعۂ رسائل البیرونی شائع کردہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۴۸ء، تیسرا رسالہ بعنوان « تمہید المستقر فی معانی الممر ».

کیا اچھا ہوتا اگر قریشی صاحب اس مقام کی نشاندھی فرما دیتے جہاں مجھ سے ترجمہ میں «لغزش» ہوئی ہے. خود انہوں نے «استیعاب الوجوہ الممکنہ» کی جو اصل عربی عبارت پیش کی ہے وہ میری معروضں کی موید ہے. البیرونی کہتا ہے میں نے اس اصطرلاب کو بیحد پسند کیا: «فاستحسنتہ جداً» سوال یہ ہے اس «استحسان» کی وجہ کیا تھی؟ یقیناً یہ اسکی کاریگری یا ندرت یا حسن اتقان نہیں تھے جنھوں نے البیرونی کو اپنی طرف متوجہ کیا ہو، بلکہ اسکی ساخت کا مبادی اصول تھا (جو اس زمانہ میں اور اس سے پہلے بھی بعض لوگوں کا عقیدہ رہا تھا) کہ حرکت کلیہ زمین کی گردش سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ آسمان کی:

«فاستحسنتہ جداً لاختراعہ علی اصل قائم ذاتہ مستخرج عما یعتقدہ بعض الناس من ان الحرکۃ المرئیۃ الشرقیۃ ھی للارض دون الفلک».

اب «گردش ارضی کے عقیدے کے اصل قائم کے استحسان» کا مطلب اگر «تسلیم» نہیں ہوسکتا تو کیا ہوگا؟ اور اگر وہ کسی وجہ سے بھی اس قلبی اذعان اور «تسلیم» کا کھل کر اظہار نہیں کرسکتا تو یقیناً وہ اسے عسیرالانحلال شبہہ «شبۃ عسرۃالتحلیل» سے تعبیر کرےگا.

اس معذرت کو کماحقہ گوش گزار کرنے کے لیے اس عہد کی علمی اور فکری تحریکات پر ایک مختصر یادداشت پیش کرنا مستحسن معلوم ہوتا ہے.

مسلمانوں کے یہاں علم الھیئت کے جو اصولی مسلمات مروج تھے، وہ بیشتر حالات میں یونانیوں سے ماخوذ تھے. یونانی ہیئت دانوں میں زمین کا سکون اور اسکا مرکز عالم میں واقع ہونا، نیز افلاک کلیہ و جزئیہ کا اسکے گرد حرکت کرنا مسلمات فن میں سے تھا. فیثاغورث اور اس کے متبعین مثلاً فلولاؤس (Philolaus) ھکیٹاس (Hicetas) ھیراکلیٹس (Heractilus) اور ایکفانٹس (Ecphantus) البتہ اسبات کے قائل تھے کہ زمین (مع دیگر سیارات کے اپنے محور پر گردش کرنے کے ساتھ ساتھ کسی «مرکزی آگ» کے گرد بھی حرکت کرتی ہے. لیکن فیثاغورثیوں کا یہ عقیدہ

عقیدہ ان کے عرفانی فلسفہ اور سرّی تعلیمات کا ایک جزو تھا اور اپنے اسطوری انداز فکر کی بنا پر کسی طرح بھی عہد حاضر کے کوپرنیکی شمس مرکزی نظریہ کی اصل نہیں کہا جاسکتا۔

بہرحال فیثاغورثیوں کا عینی عقیدہ عام یونانی فکر کو متاثر نہ کرسکا اور غیر فیثاغورثی فلاسفہ اور ہیئت‌دان زمین کو ساکن اور ثوابت و سیارات کو اس کے گرد متحرک مانتے رہتے۔ ان مفکرین میں سب سے اہم ارسطو ہے، جسکے نظام فکر نے جلد ہی دوسرے افکار و تصورات کو جنس کاسد بناکر گوشۂ گمنامی میں ڈالدیا اور جو صدیوں تک نہ صرف یونان بلکہ مسلمانوں اور قرون وسطیٰ کے یورپ میں بھی نیم مذہبی تقدس و مقبولیت کا حامل رہا۔

ارسطو کی وفات کے بعد فکری قیادت کا شرف یونان سے مصر میں منتقل ہوگیا، یہاں اسکندریہ کے اہل علم نے بطالمہ کی زیرسرپرستی اور ان کے بعد رومن قیاصرہ کے عہد حکومت میں یونانی بالخصوص ارسطا طالیسی روایات و تعلیمات کو جاری رکھا۔ أبلونیوس نے افلاطون، ایوڈوکس، کالتیس اور ارسطو کے ہم مرکز کرات کے نظریہ کو مسترد کرکے اجرام فلکی کی گردش کو خوارج (Ecentrics) اور تداویر (Épicycles) کی پیچیدہ گردش کے نظریہ میں بدل دیا۔ مگر بیادی اصول و مسلمات میں ارسطو کی « کتاب السماء والعالم » کی تعلیمات کو نوشتۂ مذہبی جیسی اہمیت حاصل رہی اور زمین کا مرکز عالم میں واقع ہونا اور ثوابت وسیار کا اس کے گرد حرکت کرنا غیر متنازع فیہ بنا رہا۔ البتہ ارسطرخس (Aristarchus) تیسری صدی قبل مسیح میں اور سلوقیہ کا سلیوکس (Seleucus) دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں اس رائے کے اندر منفرد تھے کہ سورج دیگر ثوابت کی طرح ساکن ہے اور زمین اپنے محور پر گردش کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد بھی حرکت کرتی ہے۔ مگر ان کا یہ نظریہ ارسطاطالیسی « ارض۔ مرکزیت » کے مروجہ عقیدہ کے مقابلے میں صدا بہ صحرا سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوا۔ بطلیموس جو یونانی ہیئت‌دانوں کا امام ہے اور جس کی کتاب

«المجسطی» نہ صرف یونانی ہیئت کا شاہکار ہے بلکہ علم الہیئت کی ادبیات عالیہ میں بھی نمایاں مقام رکھتی ہے ۔ اسی «ارض مرکزی نظریہ» کا قائل تھا ۔ چنانچہ «المجسطی» کے پہلے مقالہ میں زمین کی مرکزیت اور اسکے سکون کو مسلمات ہی میں محسوب کرتا ہے ۔ بطلیموس، ارسطرخس اور اسکے انداز پر سوچنے والے حکماء کے «نظریۂ گردش ارض» سے بھی واقف تھا اور «المجسطی» میں اس کا ذکر بھی کرتا ہے :

«و قد ظن قوم ان الارض متحرکة بالاستدارة حول المحور الحرکة الیومیة من المغرب الی المشرق» ۔

لیکن خود سکون ارض اور ارض مرکزی نظریہ کا علمبردار تھا ۔

یہی ارض مرکزی نظریہ یونانی ہیئت کے ساتھ مسلمانوں میں منتقل ہوتا رہا اور چوتھی صدی تک مسلمان ہیئت دانوں کا معمول بہ بنا رہا ۔ مگر چوتھی صدی ہجری میں جب ہیئت کے ساتھ اعتنا بہت بڑھ گیا اور ماہرین فن نے متداول نظریات و نتائج کے علاوہ نئے نئے تجربات و تصورات پر بھی توجہ کی تو کچھ طبیعتیں خود کو ارسطو اور بطلیموس کی کورانہ تقلید پر راضی نہ رکھ سکیں اور مروجہ افکار و تصورات سے بغاوت پر مجبور ہوئیں ۔ ان میں احمد بن عبدالجلیل السجزی پیش پیش تھا ۔ اس نے اپنے «اصطرلاب زورقی» کو اسی «شمس مرکزی نظریہ» کے اصول پر بنایا تھا ۔ چنانچہ البیرونی لکھتا ہے ۔

«و قد رایت لابی سعید السجزی اصطرلاباً . . . سماه الزورقی فاستحسنته جداً لاختراعه ایاه علی اصل قائم بذاته مستخرج مما یعتقده بعض الناس ان الحرکة الکلیة المرئیة الشرقیة للارض دون الفلک» ۔ (استیعاب الوجوه الممکنه بحواله قانون مسعودی مقدمہ انگریزی) اسی «استحسان» کی وجہ سے خیال کیا جاتا ہے کہ البیرونی خود اس «شمس مرکزی نظریہ» کی جانب رجحان رکھتا تھا' میں نے تو اپنے مضمون میں اس کی صراحت نہیں کی تھی مگر عام محققین یورپ کا یہی خیال ہے چنانچہ سارٹن نے اپنے «تعارف تاریخ سائنسیہ» میں اس کے بارے میں یہی لکھا ہے ۔

سارٹن ھی پر اعتماد کرکے بعد کے لوگوں نے اس بات کو البیرونی کی طرف منسوب کیا چنانچہ پرنسپل عبدالرحمن خاں مرحوم نے کتاب کا جو ملخص ترجمہ کیا ھے اس میں فرماتے ھیں[1]:

«اس مسئلے پر بھی اس نے بحث کی ھے کہ آیا زمین خود اپنے محور پر گھومتی ھے یا اس کے گرد آسمان چکر لگاتا ھے لیکن قطعی معلومات کے فقدان کی وجہ سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا[2]»۔

یہی نہیں بلکہ چوتھی صدی ھجری کے وسط میں (جیسا کہ البیرونی کے الفاظ «ممایعتقدہ بعض الناس» سے ظاھر ھے) یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ تھا. اس لیے البیرونی کا اپنی جوانی کے زمانہ میں اس باغیانہ نظریے کی طرف مائل ھوجانا فطری تھا جس طرح وہ ابوبکر زکریا الرازی کے ملحدانہ افکار کا اس زمانہ میں اور اس کی کتابوں کا جویا تھا اور اس کے نتیجہ میں مانویت میں دلچسپی رکھتا تھا (اگرچہ آخر میں یعنی ۴۲۷ھ کے قریب وہ دونوں سے بیزار ھوگیا)[3]. بہر حال اس نے اپنے استاد ابو نصر بن عراق سے اس اھم مسئلہ کی وضاحت کی درخواست کی اور مؤخرالذکر نے

---

(۱) قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۱: ۱۸۲

(۲) انھوں نے «البیرونی کی یادگار جلد» میں جو مقالہ لکھا تھا، اس میں تحریر کیا ھے:

"He discussed the question of the earth's rotation on its axis but failed to reach a definit conclusion, possibly for want of adequate scientific data." (*Al-Beruni's Commemoration volume*, p. 172)

اسی طرح سید ابوالکاظم استاذ شعبۂ ریاضیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسی یادگار جلد میں لکھتے ھیں:

" The great astronomer was the first to observe and solemnly asset that assumption that the earth moves round the Sun could not be disproved the explanation of which was later given by Copernicus, (1473—1543) in his helio—centric Theory." (*Ibid* p. 170)

(۳) «وانا مع براءتی من اتباعہ (اتباع ابی بکرالرازی) فیما یفسد... ثم اختصرت ما فی تلک السفر (سفرالاسرار) من الھذیان البحت والھجر المحض لیطلّا لہما ماؤف بآفتی... ولست اعتقد فیہ مخادعۃ بل إنخداعاً» (مکتوب البیرونی مورخہ ۴۲۷ھ در مقدمۂ الآثار الباقیہ ص xxxix)

اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بعنوان «رسالہ فی کریۃ السماء» لکھ کر اسے بھیجا۔ ابو نصر بن عراق نے اس رسالہ میں متداول ارسطاطالیسی بطلیموسی نظام ہیئت کی مداہنت کے ساتھ ساتھ اس خیال کی بھی تردید کی تھی کہ اجرام فلکی بیضوی مدارات میں گردش کرتے ہیں:

«فظاهران حركات الشمس و القمر على مدارات كرية و لازم متى كان ذلك ظاهرا فى حركات النيرين ان يكون كذلك فى حركات سائر الكواكب المتحيرة بذلك البرهان . ولو ان قائلا قال: فلعل حركات سائر المتحيرة على قطوع ناقصة . . . فبعكس مايقوله الناس اذ لوكانت حركتها على قطوع ناقصة فيتصور من ذات نفسه غيرما يدرك وليس فى يده حجة ولا برهان ولاسبب الى ادخال الشبهة»

البیرونی کا ایک نامور معاصر ابو سہل عیسی بن یحیی المسیحی تھا۔ اس نے البیرونی کے لیے تقریباً بارہ کتابیں لکھی تھیں ان میں سے ایک کا نام «کتاب فی سکون الارض اوحرکتہا» تھا، جو اسی موضوع پر تھی۔

غالباً چوتھی صدی کے آخری عشرے میں جرجانیۂ خوارزم کے علمی حلقوں میں بھی یہ مسئلہ رونق ہنگامۂ محفل بنا ہوا تھا اور وزیر ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کے یہاں اس پر گرما گرمی رہا کرتی تھی۔ چنانچہ البیرونی کے حریف شیخ بوعلی سینا نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ ابوالحسن سہلی کے واسطے لکھا تھا جس کا عنوان ہے۔ «کتاب قیام الارض فی وسط السماء الفہ لابی الحسین احمد بن محمد السہلی» یہ رسالہ مصر کے ایک فاضل نے شیخ کے کچھ اور رسائل نیز خیام کے تین رسالوں کے ساتھ ایک مجموعہ میں «جامع البدائع» کے عنوان سے شائع کردیا ہے۔ اس کی نویں فصل میں اس نے اپنی اس رائے کی توضیح کی ہے۔ اس کے بعد دسویں فصل میں اس مسئلہ میں جو مختلف مفکرین کی رائیں ہیں ان پر تبصرہ کیا ہے۔

غرض «استیعاب الوجوہ الممکنہ» ۳۹۱ ھ سے قبل کی تصنیف ہے کیونکہ البیرونی «الآثار الباقیہ» میں (جسے اس نے اس سن کے قریب لکھا تھا) اس کا حوالہ دیتا ہے اور یہ اس کی جوانی کا زمانہ ہے جبکہ

ہر حوصلہ مند طالب علم متداول نظریات سے منحرف اور نئے تصورات کی طرف مائل ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ۳۹۰ ھ سے قبل اس کے لیے «شمس مرکزی نظریہ» کا استحسان اور اس کی طرف میلان فطری تھا، جس طرح وہ ابوبکر زکریا رازی کی تصانیف میں دلچسپی لیتا تھا اور مانویت کی طرف شوق رکھتا تھا۔ مگر وہ رائے عامہ کے دباؤ سے جو «ارض مرکزی نظریہ» کی قائل تھی کھل کر اپنے فطری میلان کا اظہار نہیں کرتا اور صرف «شبهہ عسرة التحلیل صعبة المحق» سے اس کی اہمیت اور اس کے مستحق اعتنا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مگر بعد میں اسے اپنے خیال پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ اس میں زیادہ مؤثر اس کے اُستاد ابو نصر بن عراق کا «رسالة فی کریة السماء» تھا۔ ممکن ہے اس کے حریف (شیخ بو علی سینا) کا استدلال بھی یہی رہا ہو۔ اس نے اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ پر محققانہ نظر ڈالی اور ایک مستقل رسالہ لکھا جس کا «کتاب الہند» میں حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے: «اس مسئلہ کا حل کرنا بڑا مشکل ہے۔ قدیم اور جدید مشاہیر ہیئت دانوں نے گردش ارضی کے مسئلہ کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے اور اسے باطل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ بعنوان «مفتاح علم الهیئة» لکھا ہے۔ جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ ہم نے قدماء کی کاوشوں پر معتد بہ اضافہ کیا ہے[1]»۔

یہ ۴۲۷ ھ سے قبل کی بات ہے کیونکہ «کتاب الہند» اس سن سے پہلے مکمل ہوچکی تھی۔ مگر آخر میں (یعنی ۴۲۷ ھ کے بعد) وہ اسی قطعی نتیجہ پر پہنچا جو عام مسلمان ہئیت دانوں کا متفق علیہ ہے یعنی زمین کا مرکز عالم میں واقع اور ساکن ہونا۔ چنانچہ «قانون مسعودی» (مقالہ اول۔ باب اول۔ فصل خامس) میں لکھتا ہے[2]:

«فلیعلم الآن ان الارض لوکانت متحرکة کما ذکرنا لکان

(۱) کتاب الہند: ۱۳۹ (۲) قانون ۱: ۵۲ - ۵۳

ما ذکرنا . . . ولیس من ذلک شیٔ بموجود فلیس للارض فی مکانہا حرکۃ دوریۃ حول مرکزہا »۔

بھی نہیں بلکہ اُس نے اپنے سابق « تذبذب » کی دلیل سے بھی رجوع کرلیا کہ یہ مسئلہ ریاضیات سے حل نہیں ہوسکتا کیونکہ اس نے گردش ارضی کے ابطال میں ایک ریاضیاتی دلیل بھی دی ہے[1]:

« و اما النظر التعلیمی فی ھذا المعنی وان القول فیہ راجع الی ان الارض لوکانت متحرکۃ بہذہ الحرکۃ لتخلف عنہا ماانحاز منہا من طائر محلق اوشیٔ مرمی بہ نحو جو السماء . . . فتری حرکتہا نحو المغرب دائماً . . . لکنا نراہا متحرکۃ فی جمیع الجہات فلیست و لا ہی متحرکۃ ھذہ الحرکۃ التی بہاالليل والنہار »۔

البیرونی «قانون مسعودی» میں بھی ابو سعید السجزی کے « شمس مرکزی نظریہ » سے تعرض کرتا ہے۔ مگر « استیعاب الوجوہ الممکنہ » کی طرح اب اس کا نام نہیں لیتا بلکہ ماںدار تعریض اس کی رائے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اب وہ اس رائے کو ضعیف و مرجوح سمجھتا ہے۔ وہ ابو سعید السجزی کی رائے کی مزید تضعیف کے لیے یہ بھی بتاتا ہے کہ السجزی طبیعیات کے عام اصول کے خلاف یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ اجسام ثقیلہ عموداً زمین پر نہیں گرتے[1]۔

بہرحال سارٹن وغیرہ کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ کیونکہ «کتاب الھند» میں وہ اپنے ایک رسالے کا ذکر کرتا ہے (حوالہ پیچھے گزرا) جس میں اس مسئلے میں اس نے اپنی مستقل رائے کا اظہار کیا ہے اور آخر عمر میں تو « قانون مسعودی » میں جو اس کے ہیئتی افکار کی مستند قاموس ہے، اسی نتیجہ پر پہنچا تھا جو عام مسلمان ہیئت دانوں کا متفق علیہ ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ اپنے عہد جوانی میں « گردش ارضی » کے نظریہ کو بنظر استحسان دیکھتا تھا۔

---

(۱) قانون ۱ : ۵۰

اب اس استحسان کو چاہیے «تسلیم» سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے اور نہ سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے) یہ امر میرے موضوع سے سے خارج تھا ۔ مجھے اصولی طور پر ابو سعید السجزی کے منفردات کو گنانا تھا ۔ اس لیے میں نے «استیعاب الوجوہ الممکنۃ» کے اتنے ہی حصہ کا ترجمہ کیا (جو غالباً غلط نہیں ہے) جو ابوسعید السجزی کے عقیدے سے متعلق تھا ۔ البیرونی کے نظریات کا یہ محل نہ تھا لہٰذا اس کے «شبہۃ عسرۃ التحلیل صعب المحق» کی وضاحت سے تعرض کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک بات ضرور ہے ہرچند البیرونی آخر عمر میں «ارض مرکزی نظریہ» ہی کا قائل اور علمبردار ہوگیا تھا۔ مگر اس کے عہد جوانی کے «شبہۃ عسرۃ التحلیل صعب المحق» نے بعد کے مسلم ہیئت دانوں کی تحکمیت (Dogmatism) کی تعدیل کردی ۔ چنانچہ ہرچند کہ وہ راجہ جے سنگھ سوائی (زیج محمد شاہی) کے زمانہ تک «ارض مرکزی نظریہ» ہی کے قائل تھے لیکن حرکت ارضی کا محکمانہ انکار بھی نہیں کرتے تھے ۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین عاملی نے «تشریح الأفلاک» میں لکھا ہے : «ولم یقم دلیل علی بطلان تحرکہا حرکۃ وضعیۃ» اور ان کے شارحین نے اس قول سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں پائی، بلکہ وہ اسی کی توضیح کرتے رہے اگرچہ یہ عدم انکار انہیں کبھی جدید «کو پر نیکی نظام کائنات» سے قریب نہ لاسکا ۔

۱۶ــ صغانی اور صاغانی :

فاضل معترض کا فرمانا ہے : «ابوحامد الصغانی (نہ کہ الصاغانی)». اگر فاضل معترض نے «تحدیدنہایات الأماکن» کے مخطوطہ کے علاوہ اور کتابوں کے ساتھ بھی اعتنا کیا ہوتا تو اس نکتہ چینی کی زحمت نہ فرمانا پڑتی ۔ ابوحامد کے متعلق تحقیقی طور پر یہ معلوم نہیں کہ وہ «چاغان» کا رہنے والا تھا یا چغانیان کا : «چاغان» یا «چاغان کوہ» مرو کے نزدیک ایک گاؤں ہے جسے عربی میں «صاغان» کہتے ہیں[1]. «چغانیان» ماوراءالنہر کی ایک وسیع

(۱) یاقوت : البلدان ۵ : ۳۳۲

ولایت تھی جسے عربی میں « صغانیان » کہتے تھے۔ نسبت اس (صغانیان) سے « صغانی » اور « صاغانی » دونوں آتی ہیں۔ چنانچہ یاقوت لکھتا ہے[1]:

« صغانیان . . . یبدلون الصاد فیقولون چغانیان : ولایة عظیمة بما وراء النهر متصله بترمذ . . وقد نسبوا الیها علی لفظین صغانی و صاغانی منهم ابوبکر محمد بن اسحاق بن جعفر الصغانی . . . و عرف بالصاغانی ابوالعباس الفضل بن العباس بن یحیی الصاغانی، له تصانیف فی کل فن و تصنیفه فی الحدیث احسن منها »

اسی طرح سمعانی جن کی « کتاب الأنساب » ان نسبتوں کے باب میں معتمد علیہ مأخذ ہے، لکھتے ہیں:

« الصاغانی . . . هذه النسبة الی صاغان . قریة بمرو . . . و قد ینسب ابوبکر محمد بن اسحاق الصغانی فیقال له الصاغانی ایضاً و هو منسوب الی صغانیان . . . قال المعدلی ابوالعباس احمد بن عمران هو عم ابی علی الصاغانی الحنفی من اصل الصغانیان »

آگے چل کر « الصغانی » کے عنوان میں لکھتے ہیں:

« الصغانی هذه النسبة الی بلاد مجتمعة وراء نهر جیحون یقال چغانیان و تعرب فیقال له الصغانیان . . . والنسبة الیها الصغانی والصاغانی ایضاً و المشهور بهذه النسبة ابوبکر محمد بن اسحاق بن جعفر الصغانی . . . و ابوسعد محمد بن میسر الصغانی الضریر و یقال له الصاغانی ایضاً . . . و ابو الفضل عباس بن جعفر الصاغانی شیخ حدث بسمرقند ».

غرض صغانیان کے باشندے دونوں نسبتوں سے منسوب ہوتے تھے۔ بلکہ ایک ہی شخص دونوں نسبتوں سے پکارا جاتا تھا۔ اس لیے ابو حامد خواہ چاغان (صاغان) کا باشندہ ہو یا چغانیان (صغانیان) کا اس کی وطنی نسبت دونوں طرح لکھی جاسکتی ہے اور کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غلط ہے اور اس کے بجائے یہ صحیح ہے۔

(۲) یاقوت : معجم البلدان ٥ : ٣٦١-٣٦٢

یہ بھی واضح رہے کہ ابو حامد کے بہت سے ہمعصر شعراء و ادباء صاغانی » نسبت ہی رکھتے تھے اور اسی املاء سے ثعالبی جیسے ادیب نے یتیمۃ الدہر » میں ان کی سبت لکھی ہے، مثلاً ابو علی الصاغانی[1]، ابو العباس صاغانی[2] وغیرہما۔ پھر بھی یہ املاء میں نے محض جدت طرازی کی بنا پر ختیار نہیں کیا۔ صحت نقل و روایت کا التزام اس کا مقتضی تھا۔ میں نے بو حامد کا تذکرہ ابن القفطی کی کتاب[3] سے نقل کیا تھا اور اس نے صاحب ترجمہ کا نام « ابو حامد الصاغانی » ہی دیا ہے۔

لیکن جتنا تذکرہ البیرونی سے منقول ہے، اس میں اسی صحت نقل کے التزام کے پش نظر « ابو حامد الصغانی » (نمبر الف) تحریر کیا ہے، کیونکہ البیرونی نے اس کی نست « صغانی » ہی دی ہے۔

۱۷—مدۃ کی سہل القرآۃ تصحیف:

فاضل معترض لکھتے ہیں: « میں فاضل مضمون نگار کی ان دو « لاتوں » کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا ہوں الا ماشاءاللہ ان کا اس سے مطلب شمس کی دوران ربیع کی دوڑ جست یا رقد سے ہو » یہ لفظ « لات » نہیں ہے بلکہ « مدت » ہے جو مجلۂ علوم اسلامیہ جون ۱۹۶۱ (ص ۵۱ سطر ۱، ۲۲) میں کمپوزیٹر کی غلطی سے « ربع شرقی کی لات » چھپ گیا ہے[4]۔

۱۸—ابو نصر بن عراق کی کتاب السموت پر ابوالوفا کا تبصرہ:

فاضل معترض کا فرمانا ہے: « فرماتے ہیں جب یہ کتاب (کتاب السموت) ابوالوفا کے پاس پہنچی تو وہ اس دریافت سے مطمئن نہ ہوا اور اسے زیادہ قابل استحسان نہ گردانا۔ اس کے بالمقابل بیرونی کی یہ عبارت پڑھیے: ورد جوابہ ماظننا باستحسانہ الکتاب واستعظامہ إیاہ »۔

(اور اس کا جو جواب آیا اور جو ہم سمجھ سکے یہ تھا کہ اس نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی اور اسے ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیا

---

(۱) یتیمۃ الدہر ۴ : ۱۳—۳۹ (۲) یتیمۃ الدہر ۴ : ۳۰
(۳) أخبار الحکماء ۵۶ ، ۵۷ ، ۲۳۱
(۴) قانون مسعودی ۱ : ۳۶۴ ، ۲ : ۶۵۹ ، ۶۶۰

خیال کا ترجمہ کیا تھا۔

(الف) میں نے خود ابو نصر بن عراق کے اپنے ابو نصر بن عراق کے اصل الفاظ اس کے «رسالة فی معرفة القسی الفلکیه بعضها من بعض بطریق غیر معرفتها بالشکل القطاع» ص ۲ میں حسب ذیل ہیں:

«ورد کتاب شیخنا أبی الوفا محمد بن محمد البوزجانی علی الفقیه أبی علی الحسوبی یذکر فیه انه تامل اکثر کتابی فی السموات فوجدنی فیه سالکا مسلک المتقدمین یشیر الی عملی فی براهینه بالشکل القطاع ویصف ان طرقه التی سلکها فی المجسطی الذی عمله اخف واسهل واوجز و احسن».

جب ایک شخص دوسرے کی کاوش کو متقدمین کی کاوش کا اعادہ (بالفاظ دیگر جدت سے خالی) ٹھہراتا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی کاوش کو آسان، مختصر اور زیادہ بہتر کہتا ہے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اول الذکر کی «دریافت سے مطمئن نہیں ہے اور اسے زیادہ قابل استحسان نہیں گردانتا»۔

(ب) فاضل معترض نے «مقالید علم الهیئة» کی پوری عبارت نقل نہیں کی ورنہ البیرونی نے بھی وہی کہا ہے جو میں نے ابو نصر بن عراق کی عبارت سے سمجھا ہے۔ ابو نصر کی «معرفة القسی الفلکیه» کی عبارت اوپر مذکور ہوئی۔ «مقالید علم الهیئة» کی عبارت حسب ذیل ہے:

«ورد جوابه ما ظننا (ناطقاً) باستحسان الکتاب و استعظامه ایاه لولا ان صاحبه سلک فیه طریق القدماء فی استعمالهم الشکل القطاع والنسبة المؤلفة فان له طرقاً خفیة فی معرفة السمت اوجز من ذلک و احسن».

ابو نصر نے لکھا تھا کہ ابو الوفا نے مجھے قدماء کے طریقہ پر گامزن پایا (سالکا مسلک المتقدمین) کیونکہ ان کی طرح مجھے بھی شکل قطاع کو استعمال کرتے پایا اور البیرونی بھی یہی کہتا ہے کہ ابوالوفا نے ابو نصر پر نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے شکل قطاع اور نسبت مؤلفہ کے استعمال میں قدماء کی روش کی جادہ پیمائی کی ہے (سلک طریق القدماء)

ابو نصر نے لکھا تھا کہ ابوالوفا اپنے طریقہ کو (جسے اس نے اپنے مجسطی کے ایڈیشن میں استعمال کیا ہے) زیادہ آسان، مختصر اور بہتر سمجھتا ہے. البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ ابوالوفا «معرفت سموت» میں اپنے طریقہ کو زیادہ مختصر اور بہتر سمجھتا ہے.

(ج) البتہ انہوں نے «ما ظننا باستحسانه الکتاب و استعظامه ایاه». کے بعد «لولا ان صاحبه سلک فیه طریق القدماء... فان له طرقاً... اوجز من ذلک و احسن». کو حذف کرکے علمی ذمہ داری اور دیانتدارانہ تنقید کا کوئی اچھا معیار قائم نہیں کیا. کیونکہ اس تنقیح طلب مسئلہ کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جائیگی اور یہ کتمان حق قارئین کی گمراہی کا باعث بن جائیے گا.

۱۹—فخرالدولہ کا سال وفات:

فاضل معترض فرماتے ہیں: «اس کے بعد ہمارے فاضل نے تاریخی پس منظر پیش کیا ہے... اس بیان میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں، اول تو یہ کہ فخر الدولہ کی وفات ۳۸۸ ھ میں ہوئی نہ کہ ۳۸۷ ھ میں اور اس کے فوراً بعد قابوس بن وشمگیر طبرستان پر قابض ہوگیا... دوسرے یہ کہ اگر ۳۸۷ھ میں فخرالدولہ وفات پاچکا تھا تو ۳۸۸ میں اس کا رے میں موجود ہونا کیسے ثابت ہوا... تیسرے یہ کہ بیرونی ۳۸٤ ھ یا ۳۸۵ ھ کے ہنگامے کے بعد جرجانیہ سے رخصت ہوچکا تھا».

اس تنقید و تبصرے میں فاضل معترض کا اعتماد زخاؤ کے مقدمہ پر رہا ہے جو اس نے «الآثار الباقیہ» کے انگریزی ترجمہ پر لکھا ہے. زخاؤ کی شخصیت واجب الاحترام ہے اور اسلامیات کی تاریخ میں اس کا بڑا مقام، بالخصوص «البیرونیات» کا کوئی طالب علم اس کی تحقیقات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا. مگر «الآثار الباقیہ» کا یہ ترجمہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا جسے چوراسی سال ہورہے ہیں اور اس عرصہ میں اسلامیات کے اہم مصادر جو اس زمانہ میں مخطوطات کی شکل میں بھی کمیاب تھے، اب طبع ہوکر عامۂ اہل علم کی دسترس تک آگئے ہیں. ان مآخذ و مصادر

کی فراوانی اور سہولت حصول کے پیش نظر پچھلی صدی کی تحقیقات میں معتبہ اضافہ ہوا ہے اور ان اضافوں کی روشنی میں زخاؤ اور دیگر مستشرقین کی رایوں پر نظر ثانی ضروری ہوگئی ہے مثلاً ڈاکٹر زخاؤ نے «کتاب الھند» کے انگریزی ترجمہ کے آخر میں جو تعلیقات دی ہیں، اُن میں «زرقان» کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ قطعی غیر معروف شخصیت ہے لیکن اب جب کہ امام عبدالقاہر بغدادی کی «الفرق بین الفرق» امام ابوالحسن الاشعری کی «مقالات الإسلامیین» مرتضیٰ زبیدی کا «طبقات المعتزلہ» کی «التنبیہ والاشراف» چھپ گئے ہیں، زرقان اور اُس کی «کتاب المقالات» کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوگئی ہیں، جن کی روشنی میں اس کی رائے پر نظرِ ثانی کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ زخاؤ کا خیال تھا کہ زرقان نے فرقہ سمنیہ (بدھ مذھب) پر کوئی کتاب لکھی تھی جسے ایرانشہری نے اپنی کتاب میں شامل کرلیا تھا۔ لیکن اب ثابت ہوگیا ہے کہ اس کی «کتاب المقالات» صرف بدھ مذھب ہی پر نہیں تھی، بلکہ مختلف اسلامی اور غیر اسلامی فرقوں کے معتقدات پر مشتمل تھی جس کے اُس حصہ کو جو فرقۂ سمینہ سے متعلق تھا، ایرانشہری نے اپنی کتاب میں نقل کرلیا تھا۔ خود ابوالعباس ایرانشہری کے متعلق زخاؤ نے «الآثار الباقیہ» اور «کتاب الھند» سے جو معلومات حاصل کی تھیں، البیرونی کی دوسری کتابوں مثلاً «قانون مسعودی»، افراد المقال» وغیرہ، نیز ناصر خسرو کی «زادالمسافرین» کی اشاعت کے بعد ان پر بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اب اس کی حیثیت محض ایک «مقالات نویس» کی نہیں رہی، بلکہ ایک حکیم ثانی مذھب کی ہے۔

اسی طرح اس نے «فردوس الحکمۃ» کے مصنف کا نام «علی بن زین» بزائے ہوز و بائے حطی) پڑھا تھا[1]۔

میں نے فخر الدولہ کا سال وفات ۳۸۷ھ لکھا تھا مگر قریشی صاحب مصر ہیں کہ نہیں اس کی وفات ۳۸۸ھ میں ہوئی۔ فاضل نے اس اصرار کے جواز میں زخاؤ کی «تمہید آثار» ص۲۲ کے علاوہ عربی فارسی مأخذو

(۱) Ibid vol. II p. 258

مصادر کا کوئی حوالہ نہیں دیا ۔ اس کے برعکس میں نے فخرالدولہ کی تاریخ وفات مستند تواریخ کے مطالعہ کے بعد لکھی تھی ۔ دیکھیے « کامل » لابن الأثیر جس میں فخر الدولہ کا سال وفات ۳۸۷ھ درج ہے[1]. پھر وہ اس سال کے اہم واقعات میں « ذکر وفاة فخرالدولہ بن بویہ و ملک ابنہ مجدالدولہ » کے زیر عنوان لکھتا ہے : « فی هذه السنة توفی فخر الدوله ابوالحسن علی بن رکن الدوله ابی علی الحسن بن بویه بقلعة طبرق فی شعبان » اسی طرح ابو الفداء ۳۸۷ھ کے واقعات میں « ذکر وفاة فخرالدولہ » کو تحریر کرتا ہے : « وفی هذه السنة توفی فخرالدوله ابوالحسن علی بن رکن الدوله ابی علی الحسن بن بویه بقلعة طبرک فی شعبان واقعدوا فی الملک بعده ولده مجدالدوله ابا طالب رستم ».
اسی طرح رشید الدین فضل اللہ « جامع التواریخ » میں لکھتا ہے : « و برعقب حادثۂ او (سبکتگین) خبر وفات فخر الدوله علی بن بویه برسید و هر دو در شعبان سنة سبع و ثمانین و ثلثمائة سپری شدند »[2] . حمد اللہ مستوفی لکھتا ہے[3] : « فخرالدوله در سنه سبع و ثمانین و ثلثمائة در گزشت پسرش مجدالدوله رستم یازده ساله بود و منکوحه اش سیده بر ملک مستولی شد » .

یہ بعد کے مؤرخین کی تصریحات تھیں، عصری مؤرخین نے بھی اسی کی تصریح کی ہے کہ فخر الدولہ نے ۳۸۷ھ میں وفات پائی۔ چنانچہ گردیزی « زین الأخبار » میں جو فخرالدولہ کی وفات کے پچاس پچپن سال بعد ہی لکھی گئی تھی کہتا ہے[4] : « و امیر رضی ابوالقاسم نوح بیمار شد و درگذشت روز آدینه سیزدهم رجب سنه سبع و ثمانین و ثلثمائة و اندر شعبان این سال ابوالحسن علی بن حسن بویه نیز بمرد و امیر سبکتگین ببلخ

(۱) ابن الأثیر : کامل ۹ : ٤٤ - ٤٥
(۲) جامع التواریخ (تاریخ غزنویان و سامانیان و آل بویه) مرتبه محمد دبیر سیاقی مطبوعه چاپخانه کیهان تهران ۱۹۵۹ء میلادی ص ٦٢
(۳) تاریخ گزیده : ٤٢٦
(٤) گردیزی : زین الأخبار : ٥٨

نالان شد، قصد غزنین کرد، اندر راه بمرد و این واقعه در شعبان سنه سبع و ثمانین و ثلثمائة بود»۔

لیکن اس واقعہ کا ہم عصر مؤرخ عتبی ہے جس نے چشم دید شاہدوں کی روایت کی بنیاد پر «تاریخ یمینی» میں لکھا ہے[1] : «وردف الحادثة به (السبکتگین) فخرالدوله علی بن بویه و کانت وفاتهما فی شعبان سنه سبع و ثمانین و ثلثمائة»۔

مؤرخین سابقین کی ان تصریحات کے بعد، جن کی تعداد میں بکرات و مرات اضافہ کیا جاسکتا ہے[2] فاضل معترض کی اس نکتہ چینی پر کہ «فخرالدولہ کی وفات ۳۸۸ھ میں ہوئی نہ کہ ۳۸۷ھ میں» کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں رہتی۔

فاضل معترض کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فخرالدولہ کی وفات کے فوراً بعد قابوس بن وشمگیر طبرستان پر قابض ہوگیا۔ فخرالدولہ ضرور مرگیا تھا مگر «اس کا دربار» نہیں مرا تھا اور عہد فخری کی عظمت و شوکت باقی تھی۔ اس لیے قابوس اور اس کے ہوا خواہوں کی یورشوں کے سدباب کے لیے مدبرین دربار نے جرجان کی محافظت کے واسطے آزمودہ‌کار سپہ سالاروں کو بھیجا اور اس طرح فریقین میں معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا جو عرصہ تک چلتا رہا۔ فخرالدولہ کی وفات ۳۸۷ھ میں ہوئی اور قابوس پورے ایک سال کے بعد جرجان میں داخل ہوسکا۔ عتبی لکھتا ہے[3]: «فسار الی جرجان . . . و دخلها فی شعبان سنة ثمان و ثمانین و ثلثمائة» اسی طرح رشید الدین فضل اللہ رقم طراز ہے[4] «این بشارت بقابوس رسید . . . و روے بجرجان نهاد و در شعبان سنه ثمان و ثمانین و ثلثمائة در مسند ملک و مستقر عز متمکن نشست»۔

---

(۱) عتبی : تاریخ یمینی : ۱۰۸، ۱۰۹

(۲) مزید شواہد کے لیے دیکھیے میرخوند : روضۃ الصفا ٤ : ۵۷ اور اسی مصنف کی حبیب السیر ٤ : ۵۲

(۳) تاریخ یمینی : ۱۷٤

(٤) رشید الدین فضل اللہ : جامع التواریخ ۲ : ۱۰۲

عتبی[1] اور رشید الدین فضل اللہ[2] نے اس سال بھر کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل دی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابوس جرجان پر ۳۸۸ ھ میں قابض ضرور ہوگیا تھا، لیکن اُسے اطمینان و سکون نصیب نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس اضطراب و بے اطمینانی کی حالت میں اسے علمی سرپرستی کا موقعہ کیا ملا ہوگا۔ اس لیے البیرونی اس کے دربار میں ۳۸۹ ھ سے قبل نہیں پہنچا ہوگا۔

البیرونی کا رے جانا مسلم ہے۔ وہ خود «الآثار الباقیۃ» نیز «مقالید علم الهیئۃ» میں اس سفر کا ذکر کرتا ہے مگر اس کی تاریخ کی تصریح نہیں کرتا۔ بروکلمان کا خیال ہے کہ وہ ۳۸۲ ھ میں رے گیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، ممکن ہے یہ قیاس آرائی ہو کہ چونکہ البیرونی اور الخجندی کی ملاقات ایک مسلم الثبوت واقعہ ہے جس کا وہ «قانون مسعودی»[3] نیز «مقالید علم الهیئۃ» میں حوالہ دیتا ہے اور الخجندی کی وفات ۳۸۲ ھ میں ہوئی تھی۔ اس لیے البیرونی ۳۸۲ ھ سے قبل رے گیا ہوگا۔

اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ البیرونی نے رے کا دو مرتبہ سفر کیا ہو۔ پہلی مرتبہ نوجوانی میں ۳۸۰ ھ کے قریب اور دوسری مرتبہ پختہ عمری میں ۳۸۸ھ کے قریب۔ میں اس معروضہ پر زور تو نہیں دیتا، مگر اہلِ علم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ «قانون» اور «مقالید» میں البیرونی نے جو لہجہ اس سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ وہ اس لہجے سے قطعاً مختلف ہے جو اس نے «الآثار الباقیۃ» میں اختیار کیا ہے۔ البیرونی مستقلاً ۳۸۶ ھ تک خوارزم (کاث) میں آلِ عراق کی سرپرستی میں مقیم رہا، چنانچہ وہ اپنے محسنوں کی فہرست میں پہلے اسی خاندان بالخصوص ابو نصر منصور بن علی بن عراق کا ذکر کرتا ہے[4]:

(۱) تاریخ یمینی ۱۷۰ ـ ۱۸۸ (۲) جامع التواریخ : ۹۵ ـ ۱۰۶
(۳) قانون مسعودی ۱ : ۳٦٤ (٤) معجم الأدباء ٦ : ۳۱۲

معنی أكثر الأيام في ظل نعمة   على رتب فيهـا علوت كراسيا
فآل عراق قد غذونی بدرّهم   و منصور منهم قد تولّی غراسيا

٣٨٥ﻫ کے بعد خوارزم کے دونوں فرمانرواؤں (ابو عبداللہ خوارزمشاہ اور مأمون بن محمد والی جرجانیہ) میں چپقلش کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں سنہ ٣٨٦ﻫ کے آخر میں کاث کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ خوارزمشاہ کو تاج شاہی سے ہاتھ دھونا پڑا اور گرفتار ہوکر جرجانیہ لےجایا گیا . اسکے بعد شہر میں ہرج مرج شروع ہوا ءلاً ابونصر بن عراق بھی خاندان شاہی کے دیگر افراد کے ساتھ جرجانیہ لےجایا گیا ، جہاں وہ بعد میں رہا ہوا اور دروازہ شہر کے قریب ایک بڑی جاگیر میں رہنے لگا . البیرونی کچھ دن کاث ہی میں خانہ نشین رہا (تحصن) پھر امان لیکر ترک وطن پر مجبور ہوا (ما أحوج إلى التحصن ثم الاستيمان والاعتراب) تین سال اس کے بڑے اضطراب میں گزرے پہلے وہ راوندی اسپہبد جیل‌جیلان مرزبان بن رستم کے کنف حمایت میں پہنچا اور اسکے یہاں « مقالید علم الهیئة » تصنیف کرکے اسکے نام پر معنون کی . لیکن اس‌کے مصائب کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا کیونکہ سنہ ٣٨٧ﻫ کے آخر یا سنہ ٣٨٨ﻫ کے آغاز میں اس‌کے مربیوں کو اپنے حریف شہر یار بن شروین کے ہاتھوں جو قابوس بن وشمگیر کا طرفدار تھا ملک چھوڑنا پڑا . البیرونی بھی وہاں سے نکلا اور چونکہ اسکے مربی دربار رے کے باجگذار تھے ، اس سے وہ فطرتاً رے ہی میں متوطن ہونے کے ارادے سے چلا . مگر وہاں اس کی وہ قدر نہ ہوئی جسکی اُسے توقع تھی « الآثار الباقیه » میں وہ اسی بیقدری کا شکوہ سنج ہے[1] .

اس‌کے برخلاف « قانون » اور « مقالید » میں سفر رے کا جو تذکرہ کرتا ہے اس میں اس مایوسی کا شائبہ نہیں ہے جو کسی باکمال کو زمانہ کی قدر ناشناسی سے لاحق ہوتی ہے بلکہ ایک قسم کا احساس برتری پایا جاتا ہے جو خوردوں کو بزرگوں کی عزت افزائی سے حاصل ہوتی ہے . مثلاً « قانون »

(١) البیرونی : الآثار الباقیه : ٣٣٨

میں وہ بڑے فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ الخجندی نے اس سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا[1]:

« کمعمل ابی محمود الخجندی بالری‌فانه أوجبها دقیقتین و احدی و عشرین ثانیة وقد اعترف لی صاحبه شفاها بفساد الآلة فی احد المنقلبین .

اسی طرح «مقالید» میں اس کے لہجے کے اندر ایک خود اعتمادی ہے[2] : « ثم حالت بلد الری بعد ذالک ولقیت أبا محمود حامد بن خضر الخجندی و أحرج الیّ کتاباً عمله . . .» یہیں کوشیار بن لبان جیلی سے جو عمر میں البیرونی سے کہیں بڑا تھا ملاقات ہوئی اور باوجود اس تفاوت عمر کے اس نے اسکے سامنے بعض حقائق کا اعتراف کیا[3] : «فأما کوشیار فقد اعترف عند حضور ابی محمود لدیه ان لیس له منه الا التهذیب و الایجاز و التنقیح » .

یہ واقعات میرے پیش کردہ مفروضے کی تائید کرتے ہیں « الآثار الباقیه » میں مذکور سفر رے ان دونوں سفروں سے مختلف معلوم ہوتا ہے اور « فانی کنت فی ذلک الوقت ممتحناً من جمیع الجهات مختل الحال » سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جانب اپنے وطن مالوف (کاث) سے بےگھر ہونے کا شکوہ سنج ہے اور دوسری جانب نئی پناہ گاہ (فریم) سے نکلنے کا شاکی ہے .

رے سے وہ جرجان چلا . راستے میں کسی رئیس کے نام پر « الإستیعاب لوجوه الممکنة لصنعة الاصطرلاب» تصنیف کی جس میں وہ بار بار اپنی بےسروسامانی کا شکوہ کرتا ہے[4] .

بہر حال فاضل معترض کا یہ کہنا کہ جرجان پہنچنے سے پہلے اور رے سے رخصت ہونے کے بعد وہ غالباً مازندگان کے اسپہبد مرزبان

(۱) قـانون ۱ : ۲٦٤

(۲) «البیرونی اور اصفہبذ جلیجلان مرزبان بن رستم» از ابو محفوظ الکریم معصومی برہان (مئی ۱۹۵۵) . (۳) ایضاً : ۳۰٤ (٤) ایضاً : ۳۰۵

مقالید « رستم بن شروین کے دربار میں گیا جہاں اس نے اپنی کتاب
علم الهیئة » اس کے نام پر معنون کی محل نظر ہے . اگر یہ دعوی الخجندی
سے البیرونی کی ملاقات کی بنیاد پر کیا گیا ہے تو ناقابل تسلیم ہے .
الخجندی سنہ ۳۸۲ھ میں وفات پاچکا تھا اس لیے یہ ملاقات اس سے پہلے
ہی ہوئی ہوگی حالانکہ حسب تصریح و استشہاد فاضل معترض سنہ ۳۸٤-
۳۸۵ھ میں البیرونی خوارزم میں موجود پایا جاتا ہے .

فاضل معترض لکھتے ہیں : « دوسرے یہ کہ اگر ۳۸۷ھ میں فخرالدولہ
وفات پاچکا تھا تو ۳۸۸ھ میں اس کا رے میں موجود ہونا کیسے ثابت
ہوا » میں نے اپنے مضمون میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ فخرالدولہ ۳۸۸ھ میں
رے میں موجود تھا . لیکن اگر میرے اس فقرے سے کہ اس کا دربار
ہی ریاضی و ہیئت اور نجوم کے افاضل کا مجموعہ تھا سنہ ۳۸۸ھ
کے قریب البیرونی بھی وہاں گیا تھا » . انہیں یہ شبہہ ہوا تو یہ بے بنیاد
ہے اور عجلت فرمائی کا نتیجہ ہے « وہاں » کا مرجع رے ہے جہاں
فخرالدولہ کا دربار تھا . اور یہ اوپر واضح ہوچکا ہے کہ فخرالدولہ
کی وفات کے بعد بھی اس کا دربار اپنی پوری عظمت و شوکت کے ساتھ
باقی رہا . البیرونی اسی دربار میں پہنچا تھا

فاضل معترض کا یہ فرمانا بھی محل نظر ہے کہ « البیرونی ۳۸۱ھ
یا ۳۸۵ھ کے ہنگامے کے بعد جرجانیہ سے رخصت ہوچکا تھا » .

اولاً چونکہ ان کے ذہن میں خوارزم کی سیاسی صورت حال کا
کوئی واضح نقشہ نہیں تھا ، اس لیے انھوں نے البیرونی کا وطن جرجانیہ
فرض کر لیا تھا حالانکہ وہ کاث کا باشندہ تھا . اس لیے جرجانیہ سے
رخصت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا . ہاں وہ سنہ ۳٦۳ھ کے شروع
میں جرجانیہ پہنچا جو مامونی فرماں رواؤں کا پایۂ تخت تھا .

ثانیاً یہ ہنگامہ ۳۸٤ھ یا ۳۸۵ھ میں نہیں ہوا تھا . اس کا آغاز غرۂ شہر
رمضان سنة ست و ثمانين و ثلاثمائة (۳۸٦ھ)[1] سے ہوا جبکہ ابو عبداللہ

---

(۱) العتبی : تاریخ یمینی : ۹۲—۹۵

خوارزمشاہ نے بیخبری میں ابوعلی یمجور پر شبخوں مارا اور اسے گرفتار کرکے کاث (مدینۂ خوارزم) لےگیا ۔ جب مامون بن محمد والی جرجانیہ کو اس کا پتا چلا تو اس نے انتقام کی تیاری شروع کی (بات یرعی النجوم اوقالی ان اسبب له التدبیر علیه) ظاہر ہے اس تیاری میں وقت لگا ہوگا ۔ اس لیے مامون بن محمد کا خوارزم (کاث) پر حملہ اور اسکے نتیجے میں ہرج مرج سنہ ۳۸۲ھ سے قبل نہیں ہوا ہوگا ۔ اس ہرج مرج میں البیرونی خانہ نشیں ہوگیا ۔ «تحدید» کی ایک روایت کے مطابق جیسے فاضل معترض نے نقل کیا ہے البیرونی کی رضامندی کا منصوبہ معرض تعویق میں پڑ گیا (ما أحوج إلی تعطیل ذلک) مگر یہ تعویق عارضی تھی ۔ کیوں‌کہ حسب روایت فاضل معترض ابو الوفاء اور البیرونی سے فلکیاتی مشاہدات کے سلسلے میں خط کتابت ہورہی تھی جس کے نتیجے میں اُس نے مدینۂ خوارزم (کاث) میں سنہ ۳۸۷ھ میں چاندگہن کا مشاہدہ کیا : (و أنا بمدینة حوارزم علی کسوف قمری، رصدناه معا فی سنة سبع و ثمانین و ثلاث‌مائة للهجرة) ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۳۸۷ھ میں اپنے وطن مالوف (کاث خوارزم) میں موجود تھا ۔ اس‌کے بعد وہ مامونی نائب کاث سے امان طلب کرکے شہر خواردم سے نکل پڑا اور فریم (پریم کوہ) پہنچا جہاں اس نے مرزبان بن رستم کے نام پر «مقالید علم‌الهیئة» لکھ‌کر معنون کی ۔ لیکن سنہ ۳۸۸ھ میں قابوس کے طرفدار شہریار بن دارا نے اس شہرکو فتح کرلیا تو البیرونی یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور ہوا اور رے پہنچا ۔ مگر وہاں اس‌کی حسب دلخواہ قدردانی ہوئی ۔ اس لیے مددل ہوکر جرجان قابوس بن و شمگیر کے دربار میں وارد ہوا جہاں توقع سے زیادہ اس کا احترام ہوا[1] ۔

فاضل معترض فرماتے ہیں کہ «جرجان پہنچنے سے پہلے اور رے سے رخصت ہونے کے بعد وہ غالباً مازندران رستم بن شروین کے دربار

(۱) یاقوت‌الحموی : معجم‌الأدباء ، ٦ : ٣٠٩

میں گیا میرا خیال ہے کہ پہلے وہ مرزبان بن رستم کے یہاں گیا تھا وہاں سے رے آیا اور رے سے وہ جرجان گیا ۔

چہار مقالہ کی حکایت پنجم و مقالۂ چہارم کا تنقیدی مطالعہ :

« شیخ بوعلی سینا » اور « آل عراق » کے ذکر پر تبصرے کے ضمن میں پانچ تنقیح طلب نکات قائم کیے گیے ہیں ۔ مگر اس سلسلے میں بنیادی مسئلہ « چہار مقالہ » کی حکایت پنجم مقالۂ سوم کی تحقیق کا ہے ۔ فاضل معترض نے اس باب میں کوئی محقق بات نہیں کہی صرف رخاؤ کی رائے کو دہرا دیا ہے خود اس سلسلے میں کوئی واضح تنقید پیش نہیں کرتا ۔

قدیم مؤرخین نے اس روایت کو (باندک تغیر) اپنی تصانیف میں اس انداز سے نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس کی صحت میں کوئی شک نہیں تھا ۔ خواند میر نے اس حکایت کے صحیح ہونے کی غیر مبہم الفاظ میں صراحت کی ہے[1] ۔

« صحت پیوستہ کہ دراں آواں کہ کوکب دولت سلطان محمود غزنوی بدرجہ استقلال رسید بعضے از اہل شروفساد عرض رسانیدند کہ شیخ ابوعلی بد مذہب است ۔ سلطان محمود از غایت عصبیت قصد شیخ فرمودہ ابوالفضل حسن بن میکال را نزد خوارزمشاہ ارسال داشت و پیغام دادکہ چنان معلوم شد کہ دران دیار جمعی از افاضل عدیم المثل توطن دارند باید کہ ایشان را بپایہ سریر اعلیٰ فرستی . . . ابو ریحان و ابو الخیر ملازمت سلطان اختیار کردند و ابوعلی و ابو سہل تعجیل از خوارزم بیرون آمدہ راہ فرار پیش گرفتند و دربیابانی کہ میان خوارزم و ابیورد است سرگردانی بسیار کشیدہ ابوسہل دران صحرا از وفور تشنگی و گرما فوت شد و ابوعلی بدحال و بیمار بابیورد رسید و از انجا باستو و از استو بجرجان رفت » .

---

(۱) خواندمیر : حبیب السیر جلد : ۲جزء : ٤٤٤(تہران : ۱۳۳۳ شمسی)

قاضی احمد غفاری نے بھی اس حکایت کو «تاریخ جہان آرا» میں نقل کیا ھے مگر بقول قزوینی اس سے اتنا سہو ہوا ھے کہ «مامونیان خوارزم» اور «فریغونیان جوزجان» کو ایک سمجھ لیا ۔ قاضی نوراللہ شوستری نے «مجالس المؤمنین» میں پوری حکایت تو نقل نہیں کی صرف سلطان محمود غزنوی کے شیخ بوعلی سینا کو خوارزم سے طلب کرنے کے واقعے کو مسلم الثبوت مان کر اس کی توجیہ کی ھے کہ اس نے برسائے تعصب شیخ کو بلاکر قید کرنا چاہا اور بھی مؤرخین نے اس واقعے کو کلاً یا جزءاً نقل کیا ھے جس سے ثابت ہوتا ھے کہ وہ اس کی صحت کے باب میں متردد نہ تھے ۔

عہد حاضر میں Elliot کا رجحان بھی اس کی صحت کی جانب ھے مگر انھوں نے اسکی توجیہ اپنے طور پر کی ھے کہ شیخ نے حسد کی بنا پر البیرونی کے ساتھ جانے سے انکار کردیا[1] ۔

زخاؤ ، حسب نقل فاصل معترض ، اس قصے کی صحت کا منکر ھے ۔ اس کے انکار کی وجہ انھوں نے حسب ذیل نقل کی ھے :

« کن حالات میں اس نے اپنے وطن کو خیرباد کہا ؟ یہ سوال اب تک ایسے قصہ کہانیوں میں الجھا ہوا ھے کہ مجھے خوف ھے کہ (الف) مشرق کے لیے ذیل کی سطور تاریخ کے ایک عمدہ اور باوقار چہرے پر ایک مدھما داغ ھے ...... (ب) یہ بیان واقعات کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا ۔ (ج) یہ یقینی ھے کہ ابن سینا اور ابوسہل ۴۰۳ھ سے پہلے ھی خوارزم سے فرار ہوچکے تھے ... اور شاید ۴۰۰ھ سے بھی پہلے جب کہ ان کا مربی شاہزادہ علی بن مامون انتقال کرچکا تھا ، اس لیے کہ ابن سینا جرجان پہنچنے کے فوراً بعد شمس المعالی (م ۴۰۳ھ) کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا اور البیرونی اور ابوالخیر نے پہلی مرتبہ ۴۰۷ھ کے بعد غزنہ جانے سے پہلے

(۱) Elliot and Dawson , *History of India* (1869) ii. 3

خوارزم کو خیرباد کہا جیسا کہ سطور ذیل سے مترشح ہوتا ہے حالانکہ (د) مذکورہ بالا بیان میں ان کے زمانۂ روانگی اور وجوہات جلاوطنی کے متعلق بالکل مختلف واقعات بلا سوچے سمجھے اُلجھا دیے گئے ہیں » .

مگر زخاؤ کو یہ قصہ صرف « حبیب‌السیر » اور « نگارستان » میں ملا تھا . « چہار مقالہ » اُس وقت تک منظر عام پر نہیں آیا تھا اسی لیے اُس نے لکھا تھا « میں ابھی تک اس بیان‌کے ماخذ کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوا » .

غالباً سنہ ۱۸۹۶ء میں علمی دنیا فارسی ادب کے اس اہم شاہکار « چہار مقالہ » سے پہلی مرتبہ واقف ہوئی . اس سال ایتھے اور نولدکے نے اس پر تعارفی نوٹ لکھے . اگلے سال (۱۸۹۷ء) میں براؤن نے اسے متعارف کرایا اور سنہ ۱۹۱۰ء میں قزوینی نے اسے شائع کیا . چونکہ قزوینی ، زخاؤ کی رائے سے متأثر ہوچکے تھے اس‌لیے انہوں نے اس حکایت کی صحت میں شک و تردد کا اظہار کیا : « و کیفیت رفتن ابو ریحان از خوارزم بخدمت سلطان محمود چنانکه درین حکایت چہار مقاله مسطور است گویا بی اصل باشد»[1] اُنھوں نے اس « بے اصل باشد » کے سلسلے میں تین دلیلیں دی ہیں :

(و) « اما اینکه نظامی عروضی ابو نصر بن عراق را برادر زادۀ خوارزمشاه دانسته است از ملاحظۀ نسب هردو معلوم می‌شود که باطل است . چه خوارزمشاه ابوالعباس مأمون بن مامون بن محمد است و صاحبِ ترجمه منصور بن علی بن عراق و شاید نسبتی دیگر بین ایشان بوده است»[2] .

(ز) « آنچه درین حکایت متعلق بملاقات ابوعلی با امیر قابوس است باید مجعول و بے اصل باشد»[3] .

(۱) قزوینی : تعلیقات چہار مقاله : ۲۴۳

(۲) ایضاً : ۲۴۹ (۳) ایضاً : ۲۵۱

(ح) «مصنف را درین فقره دو سهو واضح است یکی آنکه وزارت ابوعلی در رے فرض کرده و حالانکه در همدان بوده است دیگر آنکه ابوعلی را وزیر علاءالدوله دانسته و و حالانکه او هیچ وقت وزارت علاءالدوله را ننموده»[1] .

قزوینی نے اس حکایت کے اس جزو کو «بے اصل» بتایا ہے جو البیرونی کے غزنی جانے سے متعلق ہے . لیکن حال ہی میں (سنہ ۱۳۲۳ خورشیدی) آقائے سعید نفیسی نے شیخ کی ایک مبسوط سوانح عمری «پور سینا» کے نام سے شائع کی ہے اس میں باقی حکایت کی صحت سے بھی انکار کیا ہے[2] :

«داستانی که دربارهٔ ابن سینا و محمود غزنوی رواج بسیار دارد بکلی ساختگی و نادرست است . چنان می نماید که این داستان را نخست نظامی عروضی سمرقندی در چهار مقاله جعل یا از مأخذ نا معتبری نقل کرده باشد» .

اس کے بعد اُنھوں نے اپنے تبصرے کی تائید میں تین دلیلیں دی ہیں[3]

(ط) نخست آنکه ابونصر عراق و ابوالریحان بیرونی و ابوالخیر خمار تا پایان پادشاهی خوارزم شاهیان در خوارزم مانده اند .

(ی) «دلیل دیگر این است که ابن سینا خود صریحاً در سرگذشت خویش می گوید . . . . بیرون رفتن وے از خوارزم درهمان زمانی رخ داده است که قابوس در گذشته . . . دلیل دیگر این ست که قطعاً ابن سینا در سراسر زندگی خود قابوس را ندیده و با او روبرو نشده است .

---

(۱) قزوینی : تعلیقات : چهار مقاله : ۲۵۱
(۲) سعید نفیسی : پورسینا : ۱۵۲
(۳) ایضاً : ۱۵۷

(یا) «خواجه حسین بن علی میکال که نظامی می نویسد درین واقعه رسول محمود در دربار خوارزم بوده است درست معلوم نیست کیست دربن خاندان ابو عبدالله حسین بن ابوالقاسم علی مطوعی یگانه کسی است که حسین بن علی بوده است . . . و تا حوالی ۴۵۰ زنده بوده است . . . گمان میرود این حسین بن علی که تا حدود ۴۵۰ زنده بود ۴۲ سال پیش ازان بدان درجه از احترام و اهمیت رسیده بوده باشد که محمود او را بدربار خوارزمشاه برسالت فرستاده باشد» .

لیکن یورپی فضلاء هوں یا ایرانی ادباء دونوں کے دلائل ضعیف ہیں اور ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ ایران سے سطحی واقفیت کا نتیجہ ہیں :

(الف) مشرق ہو یا مغرب دونوں ہی کے چہرے اس قسم کے بدنما داغوں سے داغدار ہیں . نہ محکمۂ «احتساب مذہبی» کی کارگزاریاں مغرب کے لیے وجہ افتخار ہیں نہ ملاحدۂ باطنیہ کی سرگرمیاں جس کے نتیجہ میں ہزاروں امراء اور علماء فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے مشرق کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات کہے جاسکتے ہیں ، بااین ہمہ یہ تاریخ کے سنگیں واقعات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا . محمود کا یہ پیغام طلب اور ابن سینا کا «فرار» بھی کچھ اس قسم کا بدنما داغ تھا .

(ب) زخاؤ نے ان واقعات کی تفصیل نہیں دی جن کی کسوٹی پر بقول اس کے یہ بیان پورا نہیں اُترتا اور نہ فاضل معترض نے ان کی وضاحت فرمائی ورنہ اس عہد کی سطحی و زیر سطحی تحریکوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان ان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے .

(ج) ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ خود زخاؤ کے ذہن میں ابن سینا کے فرار کا کوئی واضح نقشہ نہ تھا اس کے پیش نظر وہ مصادر نہ تھے جو اب عام دسترس میں آگئے ہیں بالخصوص شیخ کی خود نوشت سوانح عمری یا

ابن‌القفطی کی « تاریخ الحکماء » یا ابن ابی اصیبعہ کی « طبقات الأطباء » وغیرہ جس میں انہوں نے اس خودنوشت سوانح عمری کو ماندک تغیر نقل کیا ہے . اس قلت مصادر کی بنا پر بقول فاضل معترض وہ کہتا ہے کہ « ابن سینا جرجان پہنچنے کے فوراً بعد شمس المعالی کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا (الایہ کہ « شمس‌المعالی کے دربار » سے مراد وہ دربار ہو جو اس نے جانشین کے لیے ورثے میں چھوڑا تھا) کیونکہ ابن سینا خود کہتا ہے کہ میرے جرجان پہنچنے سے پہلے قابوس مرچکا تھا .

(د) روانگی اور وجوہ جلاوطنی کے متعلق تاریخی وضاحت آگے آرہی ہے .

(ہ) رحاؤ نے اس بیان کے مأخذ کی عدم یافت کا شکوہ سنہ ۱۸۷۹ء میں کیا تھا . لیکن اب اس قصے کا اصل مأخذ « چہار مقالہ » منظر عام پر آگیا ہے .

(و) قزوینی کی پہلی دلیل پر تبصرے سے پیشتر اس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان کی سنجیدگی و متانت کے باوجود اس حکایت پر تعلیقات لکھتے وقت وطنی عصبیت نے ان کے ذہن کو صاف نہیں رہنے دیا . اسی کا نتیجہ تھا کہ آل عراق کے استیصال کو جسے وہ خود مامونیوں کی حملہ آوری کا نتیجہ بتاتے ہیں « مامون بن محمود . . . در سنہ ۳۸۵ھ ابو عبداللہ خوارزمشاہ را گرفتہ بکشت و ممالک در تصرف وی در آمد » دوسری جگہ اسی استیصال کو انہوں نے محمود غزنوی کی طرف بلا تامل منسوب کردیا[1]:

«وآخرین ایشان ابو عبداللہ محمد بن احمد بن محمود بن عراق بودہ است کہ ابو ریحان ازو بشہید تعبیر می نماید و گویا ایشان نیز مانند بسیاری از ملوک و بیوتات قدیمۂ دیگر از سطوت شمشیر سلطان قہار محمود غزنوی منقرض و متلاشی گردیدند » :

یہی عصبیت حکایت کی کماحقہ قرات میں ان کے لیے حجاب اکبر

(۱) تعلیقات چہار مقالہ : ۲۴۸

بن گئی ۔ نظامی عروضی نے صرف اتنا لکھا تھا : « اما ابو نصر برادر زادۂ خوارزمشاہ بود » مگر قزوینی نے تعلیقات لکھتے وقت اُسے « برادر زادۂ خوارزمشاہ مامون (باضافہ مامون) پڑھ لیا اور پھر اس پر استبعاد کو اعتراض کی شکل دیدی ۔

لیکن ابو نصر بن عراق (یا ابو نصر منصور بن علی بن عراق) واقعتاً آخری خوارزم شاہی فرمان روا ابو عبداللہ خوارزمشاہ کا بھتیجا تھا ۔

ممکن ہے قزوینی کو « خوارزمشاہ » کے لقب سے التباس ہوا ہو جیسا کہ آگے تفصیل آئےگی ۔ مامونی خاندان خوارزم کے مغربی حصے میں حکومت کرتا تھا مگر مشرقی حصہ (کاث) میں خوارزم کے قدیم شاہی خاندان « خوارزمشاہ » کے لقب سے حکمراں تھا ۔ حکومت تو عربوں کی فتح کے بعد ہی اس خاندان سے نکل گئی تھی صرف خاندانی لقب رہ گیا تھا ، سو وہ بھی سنہ ٣٨٦ھ میں مامون بن محمد نے چھین کر خود اختیار کر لیا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے) اسی بنا پر نظامی عروضی سمرقندی نے ابو نصر بن عراق کو « برادر زادۂ خوارزمشاہ » کہا تھا ۔ مگر قزوینی نے اس تفصیل کو اس تعلیقات کے لکھتے وقت ملحوظ نہ رکھا اور اسی لیے اُسے یہ استبعاد ہوا ۔

(ز) شیخ بوعلی سینا اور قابوس کی ملاقات بیشک غلط ہے مگر شیخ کا جرجان پہنچنا مسلم ہے[1] چنانچہ وہ خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے :

« ثم دعت الضرورة إلى الانتقال إلى . . و منها إلى جرجان و كان قصدى الأمير قابوس فاتفق . . . . . موته . . . ثم مضيت إلى دهستان و مرضت بها مرضاً صعباً و عدت إلى جرجان » .

(۱) چنانچہ سعید نفیسی نے لکھا ہے : « در گرگان ابن سینا حتماً با خاندان قابوس روابطی بہم زدہ است چنانکہ رسالتی در عرض گرگان برای زرین گیس دختر قابوس نوشتہ است کہ ابوالریحان البیرونی ازآن یادکردہ است » (پورسینا : ٧٦)

اسی طرح اُس کا مریض عشق کے مرض کی تشخیص کرنا بھی مسلمہ واقعہ ہے اور اس باب میں بھی کوئی استحالہ یا استبعاد نہیں ہے کہ اس نے یہ علاج جرجان میں کیا تھا اور قابوس کے عزیزوں میں سے کسی نوجوان کا معالجہ کیا تھا ۔ اس لیے قزوینی نے نظامی عروضی کے اس تسامح کے باوجود لکھا ہے : « ہرچند صدق و صحت این حکایت به تحقیق نه پیوسته ولی شیخ ابوعلی سینا در کتاب قانون درفصل عشق اشارتی بدین نوع علاج فرموده گوید » . قانون کے اس طریق علاج کو ذکر کرنے کے بعد شیخ کے بعد وہ خود اس تجربے کو قانون میں نقل کرنے کا ذکر کرتے ہیں ۔ شیخ نے قانون میں لکھا ہے : « فانا قد جرّبنا هذا . . . و قد رأینا من عاودته السلامة والقوة وعاد إلی طمه و کان قد بلغ الذبول و جاوزه وقاسی الأمراض الصعبة . . . لما أحسّ بوصله من معشوقه بعد معاودة فی فی أقصر مدة » .

شیخ عموماً ان طبی تجربات کا وقت اور مقام تحریر نہیں کیا کرتا جس طرح وہ اپنے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنے کی وجہ نہیں بتایا کرتا اور صرف اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہے کہ « ثم دعت الضرورة الی الانتقال الی » اس نے رے میں مجدالدولہ دیلمی کے مالیخولیا کا علاج کیا تھا اور اس کے لیے تقویب قلب کا ایک نسخہ تجویز کیا تھا جسے وہ « الأدوية القلبية » میں بیان کرتا ہے ۔ مگر وہ مجدالدولہ کا نام بالتصریح نہیں لیتا، صرف اتنا ہی کہتا ہے[1] : « میں نے بعض اُمراء کا (جو بادشاہوں کے قائم مقام تھے) سخت قسم کے مالیخولیا کا جو مانیا (جنون) کی طرف مائل تھا علاج کیا » اسی طرح وہ (جس مصلحت سے بھی ہو) « قانون » میں وہ یہ نہیں بتاتا کہ جس شخص پر اس نے یہ نفسیاتی عمل اور تجربہ کیا تھا اور جسے اُس نے دیکھا کہ « عاودته السلامة » وہ کون تھا اور کہاں رہتا تھا ۔ لیکن قراین اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ وہ قابوس بن وشمگیر کے خاندان کا کوئی فرد تھا ۔ رہی خود قابوس سے شیخ کی ملاقات

(۱) ابن سینا : الأدوية القلبية : ۱۱۶ مترجمہ حکیم عبد اللطیف (کلکتہ ، ۱۹۵۶)

تو اس قسم کے تسامحات بڑے بڑے مستند مؤرخین سے ہوتے ہیں مگر ان کی بنا پر ان کی مؤرخانہ عظمت پر حرف نہیں آیا ۔ لہٰذا اس تسامح کی وجہ سے پورے واقعہ ہی کو مسترد کردینا غیر مستحسن ہے بالخصوص جبکہ ان دو تین مسامحات کو چھوڑکر «چہار مقالہ» کی حکایت کی تفصیلات خود شیخ کی سوانح عمری کے حرف بحرف مطابق ہیں ۔

(ح) شیخ کا وہاں جانا بھی امر مسلم ہے اور علاءالدولہ کے یہاں اس کا پایۂ عالی بھی جو وزارت کے مماثل تھا) طےشدہ امر ہے ہرچند کہ وہ اس کا باضابطہ وزیر نہیں تھا (جس طرح محقق طوسی ہلاکو کا وزیر نہیں تھا بایں ہمہ خصوصی تقرب کی بنا پر وزیر ہی سمجھا جاتا تھا) ۔ ان مختلف واقعات میں جن میں سے ہر ایک طے شدہ حقیقت ہے ، خلط مبحث کی بنا پر نظامی عروضی سے یہ تسامحات ہوئے ہیں تا ہم یہ اتنے شدید نہیں ہیں کہ نفس واقعہ ہی کو جعلی اور بے اصل قراردے دیاجائے ۔

(ط) البیرونی وغیرہ سنہ ۴۰۸ھ تک خوارزم میں مقیم رہے تھے مگر اس طویل قیام کے عملاً یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ درمیان میں عارضی طور پر جرجانیہ سے اور کہیں نہ گئے ہوں ۔

(ی) آقاے سعید نفیسی کا دوسرا اعتراض وہی ہے جس کی توضیح اوپر (ز) میں آچکی ہے ۔ البتہ جس امیر سے جرجان میں شیخ کی ملاقات ہوئی وہ قابوس نہیں تھا بلکہ اس کا بیٹا فلک‌المعالی منوچہر تھا ۔ اس لیے «سرگزشت ابن سینا» اور «چہار مقالہ» کی زیر بحث حکایت میں کوئی منافاۃ نہیں ہے ۔

(یا) یہ پیغام (افاضل خوارزم کی عربی میں طلبی) اتنا اہم نہیں تھا ، جس کے لیے ایک نئے امیر کو مامور کرنا مستبعد ہو ۔ خواجہ حسین بن علی میکال آداب سفارت کے باب میں نوآموز ہی کیوں نہ ہو مگر تھا تو اس خاندان کا فرد جس کے ارکان اس قسم کے سفارتی معاملات کو طے کیا کرتے تھے ۔ اس لیے ایک کام جو بظاہر ثقافتی روابط پر مشتمل ہو اگر ایک نوآموز ہی کو سونپ دیا گیا تو اس میں کیا استبعاد ہے ۔ اہم

، وہ تھا کہ سلطان محمود نے اسی ابوالعباس مامون کے پاس اس
ں سے سفیر بھیجا کہ وہ اس کی بالادستی کو تسلیم کرلے اور اُس
نام کا خطبہ پڑھا جائے، جس کے اوپر اُمرائے دربار اتنے مشتعل
ے کہ کچھ دن بعد ابوالعباس مامون ہی کو قتل کرڈالا۔ بہرحال ایک
موز سفیر کا محض ایک ثقافتی معاملے کے لیے بھیجا جانا کسی طرح
تبعد نہیں ہے۔ یہ اس صورت میں کہ «چہار مقالہ» کا «خواجہ حسین
علی میکال» «ابو عبداللہ حسین بن ابوالقاسم علی مطوعی» ہی ہو لیکن
سا ہونا ضروری نہیں ہے۔ آقائے نفیسی نے اپنے مقدور بھر استقصاء کی
شش کی ہے۔ لیکن تاریخ نے اس خاندان (خاندان میکالی) کے افراد
تذکرہ بالا ستقصاء رکھنے کی پروا ہی کہاں کی ہے۔

غرض اس حکایت کے سلسلے میں مستشرقین ہوں یا فضلائے ایران،
نوں نے جو کچھ کہا ہے، اُس کی حیثیت «تشکیک» سے زیادہ نہیں
ے۔ چند جزوی تسامحات سے پورے واقعہ کی صحت مقدوح نہیں ہوتی،
لخصوص جب کہ خود شیخ کے خود نوشتہ سوانح حیات اس کے مؤید
ہیں، نیز اس عہد کی سطحی و زیر سطحی تحریکات اس کے ساتھ ہم
ہنگ ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ہمیں چوتھی صدی ہجری کے ثلث
خر میں اس انقلابی تحریک کا مطالعہ کرنا ہوگا جو خراسان میں پھیلی
ہوئی تھی۔ عضدالدولہ کی وفات کے بعد اسماعیلی خلیفۂ مصر العزیز باللہ
(۳۶۵-۳۸۶ھ) کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے اور اس کے دعاۃ جو
پہلے ہی مشرقی ممالک کے عوام میں اس تحریک کا پروپگنڈا کررہے
تھے، اب باضابطہ مختلف صوبوں کے ولاۃ امراء کو اپنی تحریک میں
شرکت کی دعوت دینے لگے۔ مگر سوائے والی جرجانیہ (مامونی خاندان)
کے سب نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا۔

جرجانیہ، خوارزم کے مغربی حصہ کا نام تھا۔ مشرقی حصے میں جس
کا صدر مقام شہر کاث تھا خوارزم کا قدیم شاہی خاندان رہتا تھا جسے

الیھودی « آل عراق » سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے زیر سایۂ عاطفت اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ گزارا. مغربی حصہ، جرجانیہ (کرگانج) کے والی نے حسب تصریح عبدالقادر البغدادی، اسمعیلی دعوت کو قبول کرلیا تھا. ماوراء النہر کے سامانی امراء میں سے بھی بعض با اثر امیر اس تحریک میں شریک ہوگئے تھے. جن میں ابوعلی بن سیمجور خاص طور سے مشہور ہے اسی لیے مامون بن محمد اور ابوعلی سیمجور میں بڑی دوستی تھی. اس کے برعکس ابوعلی سیمجور اور ابوعبداللہ خوارزمشاہ والی کاث میں دشمنی تھی، چنانچہ جب امیر خراسان نوح ابن منصور (۳۶۵ـ۳۸۷ھ) نے مامون بن محمد کو «نسا» اور ابوعبداللہ خوارزمشاہ کو «ابیورد» کا علاقہ انعام میں دیا تو ابوعلی نے «نسا» تو مامون بن محمد کو دے دیا مگر ابوعبداللہ خوارزمشاہ کو «ابیورد» سے بے نیل و مرام لوٹا دیا اسی اندرونی منافرت کا نتیجہ تھا کہ جب ابوعلی سامانی لشکر سے شکست کھا کر اپنے دوست مامون بن محمد کے پاس پناہ لینے پہنچا تو ابوعبداللہ خوارزم شاہ نے ہزار اسپ کے مقام پر شبخون مار کر اسے قید کرلیا. جب مامون بن محمد والی جرجانیہ کو اس کی خبر ملی تو اس نے خوارزمشاہ پر حملہ کرکے ابوعلی کو آزاد کرالیا اور خوارزمشاہ کو قید کرکے جرجانیہ لے گیا، جہاں اسے ایک دن محفل شراب میں قتل کر ڈالا.

اب پورے خوارزم پر مامونی خاندان کا قبضہ ہوگیا اور چونکہ سامانی اقتدار ختم ہو رہا تھا، اس لیے جرجانیہ (خوارزم) کے حکمرانوں نے آزادی کے ساتھ اس تحریک کو فروغ دیا اور جرجانیۂ مشرق میں اسماعیلیوں کی انقلابی سازشوں کا گہوارہ بن گیا. لہٰذا ہر اسماعیلی داعی کرگانج (جرجانیہ) ہی کا رخ کرتا تھا چنانچہ ابو عبداللہ الناتلی جو ایک اسماعیلی داعی تھا اور جسے ابن سینا کے باپ نے اس کی تعلیم کے واسطے اپنے یہاں مہمان رکھا تھا، ابھی یہ تعلیم مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ یکایک بخارا سے کرگانج (جرجانیہ) روانہ ہو گیا، شیخ نے الناتلی کے کرگانج جانے کے وقت کی تصریح نہیں کی. لیکن

اس کے بعد جو اپنی عمر بتاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الناتلی ۳۸۶ ھ سے کچھ پہلے کرکانج روانہ ہوا تھا اور یہی وہ سال ہے جب کہ مامون بن محمد نے ابو عبداللہ خوارزمشاہ کو قتل کرکے پورے خوارزم پر قبضہ کرلیا اس لیے ابو عبداللہ الناتلی کا بخارا سے جرجانیہ جانا اس وقت کے ساتھ منطبق ہوتا ہے جب کہ ابو علی ابن سیمجور سامانی دربار سے بغاوت میں ناکام ہوکر اپنے قدیم دوست (اور ہم مسلک) مامون بن محمد سے خط کتابت کررہا تھا. اس لیے یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ یہ خط کتابت سیاسی کے ساتھ مذہبی اور انقلابی بھی تھی اور غالباً اسی وجہ سے ابو عبداللہ الناتلی یکایک بخارا سے جرجانیہ روانہ ہوا تھا کہ اس انقلابی سازش کے بروے کار لانے میں حصہ لے سکے.

۳۸۹ ھ میں ایلک خان والی کاشغر نے آخری سامانی فرمانروا عبدالملک بن نوح کو شکست دے کر اسے اور سامانی خاندان کے دوسرے افراد کو مختلف مقامات میں قید کردیا اور سلطان محمود غزنوی کے ساتھ صلح کرلی کہ «ماوراء النہر خان را باشد و ما دون النہر امیر محمود را» مگر ایک سامانی امیرزادہ ابو ابراہیم قید سے نکل بھاگا. کچھ دن بخارا میں چھپا رہا. اس کے بعد وہاں سے نکل کر روانہ ہوا. اسماعیلی ہر چند کہ انقلاب کے خواہاں تھے مگر ایلک خان کے قبضے سے، جسے ان کے جانی دشمن محمود کی تقویت حاصل تھی، ان کا مقصد حل نہ ہوا. اس لیے انہوں نے شورش جاری رکھنے کے لیے ابو ابراہیم منتصر کو موروثی ملک کی بازیابی کے نام سے پھر ابھارا اور اسے جرجانیۂ خوارزم لے گیے وہاں سے اس نے اپنے نائب ارسلان بالو کو بخارا کی فتح کےلیے بھیجا. ارسلان بالو نے آکر ایلک خاں کے نائب جعفر تگین کو دیگر سرداران لشکر کے ساتھ گرفتار کرکے ابو ابراہیم منتصر کے پاس جرجانیہ بھیجا[1].

اس سے اسمعیلیوں کی انقلابی تحریک میں جرجانیہ کی مرکزیت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے.

---

(۱) تاریخ یمینی : ۱۳۶

ارسلان بالو نے سمرقند کو بھی فتح کرلیا اور ابو ابراھیم منتصر دوبارہ بخارا پہنچ کر آبائی تخت پر متمکن ہوا ۔ مگر جب ایلک‌خاں کو خبر ملی تو وہ اس کے تدارک کے لیے دوبارہ بخارا پر حملہ آور ہوا ۔ اس لیے ابو ابراھیم کو بخارا سے بھاگنا پڑا اور وہ آمل اور ابیورد ھوتا ھوا نیساپور پہنچا ۔ اسکے مفرور ہونے کے بعد اس کے متوسلین اور دیگر اھل‌سازش کی تلاش کی گئی ۔ ان ھی میں بخارا کے اسمعیلی بھی تھے ۔ اس لیے شیخ ابوعلی سینا کے لیے بخارا میں رھنا ناممکن ھوگیا اور اب اس کے لیے اسکے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جرجانیہ (کرگانج) جاکر پناہ لے جو اسماعیلیوں کی انقلابی کارروائیوں کا مرکز تھا چنانچہ وہ خود لکھتا ھے کہ سنہ ۳۹۲ھ میں حالات نے مجبور کردیا کہ وہ بخارا چھوڑکر جرجانیہ (کرگانج) چلا جائے[1] مگر وہ دیگر مواقع کی طرح اس موقع پر بھی اس مجبوری کی کھل کر تصریح نہیں کرتا ۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں قابل غور ھے وہ سلطان محمود غزنوی کی « قرامطہ بیزاری » ھے ۔ اسی یقین دھانی کی بدولت خلیفہ القادر باللہ عباسی نے اسے اس کے بھائی کے مقابلے میں تخت غزنی کا وارث تسلیم کیا تھا اور محمود نے آخر تک اس وعدہ کو نبھایا ۔ اسی باطنیت کے استیصال کے لیے اس نے ملتان پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں انند پال سے جھگڑا ھوا جو ھندوستان پر اس کے بعد کے حملوں کا مفتتح بنا ۔ اسی باطنیت کے استیصال کے لیے اس نے ۴۰۷ ھ میں خوارزم پر حملہ کرکے اسے اپنی حکومت میں شامل کیا ۔ اسی باطنیت کے استیصال کے لیے اس نے ۴۱۷ ھ میں خفیف والی سندھ پر حملہ کرکے سندھ کو فتح کیا ۔ چنانچہ شعرائے دربار میں سے فرخی نے اس موقعہ پر جو قصیدہ کہا تھا اس میں فتح سندھ کی مبارکباد کے علاوہ مصر پر حملہ کی بھی تحریض کی تھی جو اسماعیلیت کا مستقر تھا :

ژندہ پیلان گر دو دریای سند آوردہ ای سال دیگر بگذرانی از لب دریای نیل

(۱) طبقات الاطباء : ۲ : ۴

قرمطی چندان کشی کز خون شان تاچند سال
چشمه های خون شود در بادیه ریگ مسیل
تا ز جامهٔ سوگواران بر زنان مصریان
همچو زر بخشش تو مست گرداند کفیل
وان سگ ملعون که خوانند اهل مصر اورا عزیز
بسته و خسته بغزنین اندر آورده ذلیل

ایک اور قصیدے میں رے پر حملہ کے لیے برانگیختہ کرتا ہے:

رے را بہانہ نیست، بباید گرفت پس
وقت است اگر بجنگ سوی رے کشد عنان
اینجا همی یگان و دوگان قرمطی کشد
زینان به رے هزار بیابد یک زمان

اور اسی "قرامطہ کشی" اور استیصال باطنیت کے لیے اس نے رے پر حملہ کرکے اُسے اپنی قلم رو میں داخل کرلیا، چنانچہ فرخی نے اس موقعہ پر کہا تھا:

اے ملک گیتی، گیتی تراست حکم تو بر هرچه تو خواهی رواست
از پی کم کردن بد مذهبان در دل تو روز و شب اندیشهاست
تا سر آنان چو گیا بدروی کایشان گویند جهان چون گیاست
ملک رے از قرمطیان بستدی میل تو اکنون به منا و صفاست

یہ محض شاعرانہ حسن تعلیل ہی نہیں تھی بلکہ رے کی فتح کے بعد محمود نے خلیفہ القادر باللہ کو جو فتحنامہ بھیجا تھا، اس سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے[1].

لیکن مجدالدولہ والی رے سے زیادہ سخت جان علاء الدولہ ابن کاکویہ ثابت ہوا اور اس کے فتنے کو مزید شہ شیخ بوعلی سینا سے ملی۔ بہرحال تیسری قابل غور بات شیخ بوعلی کی اسماعیلیت ہے۔ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ شیخ کا خاندان اسماعیلی المذہب اور مصری خلیفہ کا تابع تھا[2].

---

(۱) ابن الجوزی: المنتظم ۸: ۳۸ (۲) ابن تیمیہ: الرد علی المنطقیین: ۱۴۱.

خود شیخ بوعلی سینا اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے[1] :

« و کان أبی ممن أجاب داعی المصریین ویعد من الاسماعیلیة و قد سمع منهم ذکرالنفس والعقل . . و کذلک أخی وکانوا ربما تذاکروا بینهم و انا اسمعهم وادرک مایقولونه و لا تقبله نفسی و ابتدا و یدعوننی الیه » .

بیہقی « تتمۃ صوان الحکمۃ » میں لکھتا ہے کہ اس کا باپ رسائل « اخوان الصفا » کا (جو باطنیہ فرقے کی مستند کتاب ہے) مطالعہ کیا کرتا تھا اور شیخ بھی اکثر اس پر غور و خوض کیا کرتا تھا[2] اور انہیں اسماعیلی تعلیمات اور یونانی فلسفہ کے امتزاج سے اس نے اپنا مخصوص فلسفیانہ نظام مرتب کیا جو ارسطاطالیسی فلسفہ و ما بعد الطبیعات سے قطعاً مختلف ہے[3] .

لیکن ابن سینا کی اسماعیلیت محض فلسفیانہ عبقریت تک محدود نہ تھی . اس نے اس تحریک میں عملی حصہ بھی لیا اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی انقلابی تحریک کی تنظیم میں صرف ہوا .

چوتھی قابل غور بات محمود غزنوی اور بوعلی سینا کے تعلقات ہیں . اوپر ذکر آچکا ہے کہ مشرق میں اسماعیلیت کا گہوارہ خوارزم (جرجانیہ) تھا جب اسماعیلی دعاۃ بخارا میں سامانی حکومت کے خاتمے پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے میں ناکام ہوگئے تو وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوئے . انہیں میں شیخ بوعلی سینا بھی تھا . بخارا سے وہ خوارزم پہنچا اور بظاہر دربار خوارزم کے بورڈ کی حیثیت سے دس گیارہ سال علم و حکمت کی خدمت انجام دیتا رہا لیکن اندر ہی اندر وہ اس انقلابی تحریک کی تنظیم میں مصروف کار تھا .

اس دس سال کے عرصہ (۳۹۳ ـ ۴۰۳ھ) میں سلطان محمود ملتان اور دیگر ولایات ہندستان کی فتح میں مشغول تھا اور اس عرصہ میں

(۱) عیون الأنباء فی طبقات الأطباء ۲ : ۲

(۲) البیہقی : تتمۃ صوان الحکمۃ : ٤

(۳) الرد علی المنطقیین : ۱٤٤

اؤد والی ملتان کی تادیب (سنہ ٣٩٦ھ) لور کلی استیصال (سنہ ٤٠١ھ) کے
ریعہ مشرقی سرحد کو باطنیہ کی ریشہ دوانیوں سے پاک کر لیا اتنے
، سنہ ٤٠٣ھ میں اسماعیلی خلیفۂ مصر کا سفیر تاہرتی غزنوی سلطنت
ین آیا مگر سلطان کے حکم سے نیشاپور میں روک دیا گیا ۔ اس کی
لاشی لی گئی تو اسکے ہمراہ باطنی لٹریچر ملا جسے وہ اپنے دعاۃ میں
سیم کرنے کے لیے لایا تھا ۔ فقیہ ابو بکر محمد بن اسحاق کرّامی نے
س کا امتحان لیا تو معلوم ہوا کہ سفارت کا ڈھونگ ہی ڈھونگ تھا ۔
صل مقصد کچھ اور تھا ۔ لہذا دارالسلطنت میں طلب کیا گیا وہاں حسن
ن طاہر بن مسلم بے جو ایک جلیل القدر سید تھے اور جن کا خاندان مصر
یں رہ چکا تھا اس کی اور پول کھولی ۔ ادھر خلیفہ القادر باللہ کا خفیہ
کتوب سلطان کے پاس آیا ہوا تھا ۔ بہرحال تاہرتی قتل کیا گیا ۔ عتبی
ے جو اس واقعہ کا معاصر مؤرخ ہے اور چشم دید واقعہ نگار بھی، سفیر
مصر کے آنے کی پوری تفصیل دیتا ہے[1] ۔

ظاہر ہے ان واقعات کے بعد محمود کا باطنی دعاۃ بالخصوص اس
تحریک کے ان کارناموں کی جانب سے جو خوارزم کے اندر اس انقلاب
کے لیے اندر ہی اندر کوشش کررہے تھے چوکنا ہوجانا فطری تھا ۔ لہذا
اس نے افاضل خوارزم کو اپنے دربار میں بلانے کے بہانے سے اس تحریک
کے « خطرناک کارکن » کو غزنی میں نظربند کرلینا ضروری سمجھا ۔ آیندہ
تاریخی واقعات نے اس بات پر مہرتوثیق ثبت کردی کہ یہ « خطرناک
کارکن » شیخ بوعلی سینا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور یہ کہ اس کی
جانب سے سلطان کو جو خطرات تھے وہ بے بنیاد نہ تھے ۔

بہرحال شیخ بوعلی سینا ، محمود کے قاصد (خواجہ حسین بن علی میکال)
کے جرجانیہ پہنچنے سے پہلے ہی نکل بھاگا اور ایک بالکل غیر معروف
ور دشوارگزار راستے سے جرجان روانہ ہوگیا ۔ مگر قابوس بن و شمگیر
جس کی نیت سے وہ چلا تھا ، اس کے جرجان پہنچنے سے کچھ دن پہلے

(١) العتبی : تاریخ یمینی ٢٩٦ : ٢٩٩ نیز دیکھیے گردیزی : زین الأخبار : ٧١

قتل ہوچکا تھا. نظامی عروضی سمرقندی راستے کی تکلیف کا ذکر کرتا ہے
کہ شدت تشنگی سے ابوسہل مسیحی کا درمیان راہ میں انتقال ہوگیا . شیخ
سخت جان تھا کسی نہ کسی طرح ابیورد پہنچ گیا[1]. جرجان پہنچ کر اسے معلوم
ہوا کہ قابوس جسکے پاس پناہ لینے وہ آیا تھا، مرچکا ہے تو اس خبر نے
اس کا دل توڑ دیا اور دہستان پہنچ کروہ «مرض صعب» میں مبتلا ہوگیا .
بہرحال کچھ دن تندرست ہونے کے بعدوہ جرجان میں مقیم رہا ، مگر
سیاسی حالات نے ایک اور کروٹ لی ، قابوس کے جانشین ملک‌المعالی
منوچہر نے سلطان محمود کی بالادستی تسلیم کرلی کچھ دن بعد سلطان‌کی
لڑکی سے اسکی شادی بھی ہوگئی . اب شیخ کے لیے جرجان میں رہنا
ناممکن ہوگیا. لہذا یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا اور رے پہنچا جو باطنیوں
کا ایک اور گڑھ تھا (ملاحظہ ہو محمود کا مکتوب بنام خلیفہ القادر باللہ
عباسی). لیکن رے پر ہر آن محمود کے حملہ کا اندیشہ تھا جو بالآخر سنہ
۴۲۰ھ میں ہوکر رہا اس لیے وہاں سے بھی بھاگنے پر وہ مجبور ہوا. جیساکہ
اس کا شاگرد ابو عبید جورجانی لکھتا ہے[2].

رے سے وہ پہلے قزوین اور پھر ہمدان پہنچا ، جہاں مجدالدولہ
دیلمی کا دوسرا بھائی شمس‌الدولہ حکمراں تھا یہاں اس نے اپنی انقلابی
سرگرمیوں کو تیز سے تیز ترکردیا . اس سے لشکر اس کی جان کا
دشمن ہوگیا . اتنے میں شمس‌الدولہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا
سماءالدولہ اس کا جانشین ہوا . اس عرصے میں شیخ نے علاءالدولہ ابوجعفر
ابن کاکویہ والی اصفہان سے جو کھلا ہوا شعوبی تھا ، خفیہ خط
کتابت شروع کی . وزیر تاج الملک کو خبر ہوئی تو اس نے قلعہ فردجان
میں قید کردیا . کچھ دن گذرے تھے کہ علاءالدولہ نے حملہ کیا تاج الملک
شکست کھاکر خود بھی اس قلعے میں پناہ گزیں ہوا. علاءالدولہ کے واپس
جانے پر تاج الملک نے شیخ سے مفاہمت کرنی چاہی مگر نہ ہوسکی.

---

(۱) چہار مقالہ (گب میموریل سیریز) : ۷۸
(۲) طبقات الأطباء ۲ : ۵

آخرکار کچھ دن بعد بھیس بدل کر شیخ، علاءالدولہ کے یہاں پہنچا اور آزادی سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی، اسکے نتیجے میں سلطان محمود اور علاءالدولہ کے درمیان لڑائیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ چھڑ گیا۔ محمود کی سطوت و شوکت کے مقابلے میں علاءالدولہ کی ہستی ہی کیا تھی مگر یہ شیخ ہی کا کارنامہ تھا کہ ممولے کو شاہین سے لڑا دیا اور اس طور سے بھڑایا کہ لشکر محمودی کے دانت کھٹے کردیے مگر شیخ کا کمال تھا کہ ہزیمتوں کے باوجود (جن میں شیخ کا اثاثہ حتی کہ کتابیں تک لٹ گئیں)[1] وہ محمود اور محمود کے بعد اس کے بیٹے مسعود کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔

دنیا، بیکونن (Bikunin) اور کروپوٹکین (Kropotkin) کی انقلابی سرگرمیوں کو جانتی ہے مگر ابن سینا کی سرگرمیاں کچھ کم خطرناک نہیں تھیں اس لیے اگر محمود کی دور اندیشی نے سنہ ۴۰۳ھ ہی میں اس آفت روزگار کی اہمیت کا اندازہ لگاکر اس کی خطرناک سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے اور اسکی فتنہ پردازیوں کا سدباب کرنے کے لیے اسے جرجانیۂ خوارزم سے بلاکر غزنی میں شہر بند کرنا چاہا تو یہ بالکل فطری تھا۔ البتہ اس معاملے کو اہمیت نہ دینے کے لیے اس نے خوارزم کے سارے افاضل کو طلب کیا ابو نصر ابن عراق اور البیرونی کو کوئی اندیشہ نہ تھا لہذا وہ بطیب خاطر اسکے دربار میں پہنچے۔ سلطان کو بھی ان نجومی ہیئت‌دانوں کی چنداں ضرورت نہ تھی اس سے جلد ہی انھیں واپس کردیا گیا۔

یہ ہے پس منظر «چہار مقالہ» کی اس حکایت کا اور اس کی روشنی میں اسکے اندر کوئی استبعاد نظر نہیں آتا بلکہ حکایت فطری معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ اور خود شیخ بوعلی سینا کی خود نوشت سوانح عمری اس کی تائید کرتی ہے۔ قدیم مؤرخین نے بھی اس کی صحت میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ عہد حاضر میں (Elliot) اُسے حرف بحرف تسلیم کرتا ہے اس لیے اگر اس عاجز نے اس حکایت کے باب میں زخاؤ کی تقلید کے بجائے ایلیٹ کا اتباع کیا تو غالباً بیجا نہیں کیا۔

---

(۱) اخبار الدولۃ السلجوقیہ : ٦

۲۰ ۔ البیرونی کا سفر جرجانیہ :

مضمون نگار لکھتے ہیں : « البیرونی کا ۳۹٤ھ میں جرجانیہ پہنچنا کسی مأخذ سے ثابت نہیں ہوتا ۳۹۱ھ یا اس کے کچھ بعد سے ٤۰۰ ہجری تک البیرونی کا کسی مأخذ سے جرجانیہ پہنچنا ثابت نہیں ہوتا » لیکن میرا یہ خیال کسی خارجی مأخذ سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ خود البیرونی کی اپنی تصانیف کی داخلی شہادت پر مبنی ہے ۔ وہ « قانون مسعودی » میں لکھتا ہے کہ سنہ ۳۹۳ھ میں وہ جرجان میں موجود تھا جہاں اس نے دوچاند گہنوں کا مشاہدہ کیا تھا اور سنہ ۳۹٤ھ میں جرجانیہ میں تیسرے چاندگہن[1] کا ۔ اس باب میں « قانون » کی شہادت حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

۲۱ ۔ البیرونی اور ابن سینا کے مناظرے :

راقم نے عرض کیا تھا کہ غالباً دونوں میں علمی مناظرے سنہ ۳۹۲ اور ۳۹٤ھ سے پہلے شروع ہوگئے تھے ۔ ڈاکٹر رحاؤ کا بھی تو انہوں نے یہی قول نقل کیا ہے : « بیرونی اور ابن سینا کے درمیان علمی مناظرہ بھی ہوا ، جس کا ذکر بیرونی نے « آثار » میں کیا ہے ۔ یہ ۳۹۰ ۔ ۳۹۱ھ سے پہلے کا واقعہ ہے جبکہ ابن سینا ابھی بخارا میں تھا اور اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی » ۔

بہرحال میرا مأخذ خود « الآثار الباقیۃ » ہے جہاں البیرونی ، شیخ کی رائے مناظرانہ رنگ میں پیش کرتا ہے :[2]

« وقد ذکرت ذلک فی موضع آخر ألیق به من هذا الکتاب و خاصة فی ماجری بینی وبین الفتی الفاضل ابی علی الحسین بن عبدالله بن سینا من المذاکرات فی هذا الباب» .

اور چونکہ « الآثار الباقیہ » کا سال تصنیف ۳۹۰ھ ہے اس لیے یہ مناظرے ۳۹۰ھ سے قبل ہی شروع ہوگئے تھے ۔ پروفیسر صاحب نے اس ضمن میں « تتمۃ صوان الحکمۃ » کے کچھ اقتباسات دیے ہیں ۔ لیکن ان

(۱) البیرونی : قانون مسعودی ۲ : ۷٤۰ ۔ ۷٤۱
(۲) الآثار الباقیہ ۔ ۲۵۷

سے پیشتر یہ عاجز بھی ان مناظروں کا ایک مختصر تاریخی جائزہ دے چکا ہے جس کا اعادہ موجب تطویل ہوگا[1] .

۲۲ - ابونصر بن عراق کا سال وفات :

فاضل معترض میرے اس بیان کہ ابو نصر بن عراق کا سال وفات ۴۰۳ ھ اور ۴۰۷ ھ کے درمیان ہے . صواب سے دور اور غیر مستند قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اس کی وفات ۴۱۶ ھ اور ۴۲۷ھ کے درمیان ہوئی .

اور اس کی تائید میں « تحدید نہایات الأماکن » کا ایک فقرہ پیش کرتے ہیں جس میں البیروی نے اپنے کسی کرم فرما کے لیے « شیخ » کا لفظ استعمال کیا ہے : « لما کانت العقول محتاجة الی الاستمداد . . . فاخلق بی ان اعرض مایخطر بالبال . . . علی الشیخ » ان کا خیال ہے کہ یہ « الشیخ » ابو نصر بن عراق ہی ہے حالانکہ البیرونی اپنے استاد کی طرح تواضعاً بھی اپنے کرمفرماؤں کے لیے « الشیخ » کا لفظ استعمال کرتا ہے . جس رئیس کے نام پر اس نے « الاستیعاب بوجوہ الممکنة فی صنعة أصطرلاب» معنون کی تھی اسے بھی « الشیخ ایدہ اللہ » کہتا ہے حالانکہ وہ ابو نصر بن عراق نہیں تھا .

رہا جو کچھ میں نے عرض کیا تھا کہ ابو نصر بن عراق کا سال وفات ۴۰۳ اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ سنہ ۴۰۳ ھ میں تو ابو نصر بن عراق جرجانیہ سے غزنی جاتا ہے اس‌لیے اسے زندہ ہونا چاہیے . سنہ ۴۰۷ھ میں فتح خوارزم کے موقع پر یا اسکے بعد بھی ابونصر بن عراق کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا (یہ میرا سنہ ۱۹۶۱ء میں قیاس تھا) اس لیے وہ مردہ ہوگا لہذا میں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اس‌کا سال وفات ۴۰۳ھ اور اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے .

لیکن اب میں نے پچھلی لا ادریت کہ « نہ اس کا سال وفات ہی صحیح طور پر متعین ہے » اور سابق عدم تعین کہ « ابو نصر بن عراق کا سال وفات

(۱) معارف (ستمبر ۱۹۶۰ء) : ۱۸۹ - ۱۹۱

۴۰۳ھ اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے، دونوں سے رجوع کرلیا ہے. اب میری قطعی رائے ہے کہ « ابو نصر بن عراق کا سال وفات ۴۰۸ھ ہے. سبکی کی « الطبقات الشافعیہ» میں امام محمود بن محمد بن العباس بن ارسلان الخوارزمی کے تذکرے میں درج ہے کہ انہوں نے آٹھ جلدوں میں خوارزم کی تاریخ بھی لکھی تھی. آگے چل کر سبکی نے اس تاریخ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے جو خوش قسمتی سے ابو نصر بن عراق کے تذکرے پر مشتمل ہے اور جس میں اس کا سال وفات بھی متعین طور پر مذکور ہے .

محمود نے حرجانیہ حسب تصریح گردیزی ۵ صفر سنہ ۴۰۸ھ کو فتح کیا تھا[1] اس لیے ابو نصر بن عراق بھی سنہ ۴۰۸ھ میں قتل ہوا . بہر حال فاضل معترض کی یہ نئی دریافت کہ « اسکی وفات ۴۱۶ھ اور ۴۲۷ھ کے درمیان ہوئی» صحت سے دور ہے اور انکی عجلت پسندی کا نتیجہ ہے .

فاضل معترض نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ (بوعلی سینا) کا علم ہیئت کی ترقی میں کیا حصہ ہے جس کا بیرونی نے اعتراف کیا ہو الا یہ کہ بیرونی کی ہجو ملیح کو اعتراف کا درجہ دے دیا جائے . اس کا جواب « ریاضیات شفاء » سے مل سکتا ہے مگر یہ ایک مستقل بحث ہے اور مستقل شرح و بسط کی مقتضی .

[۱۱/ ۱۲ / ۱۹٦۳م]

* * *

---

(۱) گردیزی: زین‌الأخبار : ٧٤

صدرالدین علی بن ابی‌الفرج البصری

ڈاکٹر مختارالدین احمد*

عربوں کا عہدِ عباسی، دواوین کی ترتیب اور شعری مجموعوں کی تالیف کے لیے بڑا سازگار ثابت ہوا۔ «المفضلیات»، «الأصمعیات»، «کتاب الإختیارین» «جمهرة أشعار العرب»، «مختارات أشعار العرب»، «منتهی الطلب من أشعار العرب» اور دوسرے مجموعوں سے جن کی فہرست طویل ہے قطع نظر، ایسے مجموعوں کی تعداد بھی خاص ہے جن کی طرح ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) نے ڈالی۔ وہ پہلا شخص ہے جس کے انتخاب کردہ مجموعے کے لیے «الحماسة» کا نام تجویز ہوا۔ اس سے پہلے عام طور پر قصیدوں کے انتخابات اور مجموعے بنا کرتے تھے، اب مقطعات کی باری آئی اور چھوٹے چھوٹے قطعے بھی مجموعوں میں جگہ پانے لگے۔ ابو تمام کا انتخاب بڑا مقبول ہوا۔ اس نے شعری مجموعے کی ترتیب کی ایک نئی راہ نکالی اور خود اس منزل کا مسافر اور میرکارواں بھی بنا۔ دنیائے ادب کو اس طرح ایک اچھے شاعر سے بڑھ کر اچھا نقاد، اور شعری حسن کو پرکھنے والا ایک فنکار مل گیا۔ اس کی اپنی شاعری سے زیادہ اس کی تنقیدی صلاحیتوں اور اس کے حسن ذوق کو سراہا گیا اور اسکے انتخاب کو ایک بڑا ادبی کارنامہ سمجھا گیا، اسی لیے صدیوں سے یہ معمول رہا ہے کہ «دیوان ابو تمام» سے «حماسۂ ابو تمام» کو کہیں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ابوتمام کی اس کتاب پر جس قدر علماء نے کام کیا ہے اور جس قدر شروح اور حواشی لکھے ہیں اسے بتانے کے لیے ایک علیحدہ مضمون چاہیے۔

(*) ڈاکٹر مختارالدین احمد، ریڈر ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

«حماسة» کے لغوی معنی جنگ میں شجاعت و بسالت کے ہیں۔ ابو تمام کی کتاب کا پہلا باب «باب الحماسة» ہے اسی مناسبت سے پوری کتاب کا نام «الحماسة» ہوگیا۔ بعد کے لوگوں میں بھی یہ سنت جاری رہی۔ البحتری (م ۲۸٤ھ)[1] جو خود ابو تمام کا شاگرد اور اس کا خوشہ چین تھا، پہلا شخص ہے جس نے اسکی پیروی کی اور اپنے عمل میں کچھ نئی راہیں پیدا کیں۔ «حماسۂ ابو تمام» میں کل دس ابواب تھے۔ اس نے بڑھاکر ۱۷٤ ابواب یا عنوانات قائم کیے اور ان کے تحت اشعار جمع کیے۔ اس میں قطعات بھی زیادہ تعداد میں جمع کیے ہیں جن کی تعداد ۱٤٥٤ تک پہنچتی ہے۔ ابن الشجری (م ٥٤۲ھ) کے پیش نظر «حماسۂ ابوتمام» نہ تھا بلکہ ممکن ہے «حماسۂ بحتری» ہی ہو[2]۔ اس نے افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی راہ نکالی، بحتری کے یہاں ابواب بہت زیادہ تھے اور اس سے قارئین کو آسانی اور دل چسپی کے بجائے وحشت ہوتی ہے۔ اس نے اپنے یہاں مختصر لیکن ضروری ابواب رکھے اور یوں یہ مختصر سی کتاب بہت مقبول ہوئی۔

یہ چند وہ حماسے ہیں جو ہمارے سامنے شائع ہوکر آچکے ہیں لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حماسوں کی تعداد ختم ہوگئی۔ ذیل میں چند اُن حماسوں یا اُن مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو «حماسہ» کہلاتے ہیں، یا اس طریقے پر لکھے گئے ہیں، اس لیے کہ بعد کے دور میں «حماسہ» ہر اس مجموعے کو کہنے لگے جس میں قطعات جمع کیے گئے ہوں، خواہ

(۱) Brockelmann, *Geschichte der Arabischen Literature* (Leiden, 1937-1949) I, 7?

(۲) لیکن یہ یقینی نہیں، بحتری کے حماسے کی کم یابی کا یہ حال رہا ہے کہ عبدالقادر البغدادی (متوفی ۱۰۹۳ھ) تک کو یہ کتاب نہیں ملی تھی اور نہ انھیں اس کتاب کا پتا تھا: «ولم سمع أن للبحتری حماسة» الخزانة (۳ : ٥۹۱). خود بیسویں صدی میں جب لویس شیخو الیسوعی اسے شائع کر رہے تھے تو لائیڈن کے ایک نسخے کے علاوہ انہیں دنیا بھر میں کوئی دوسرا نسخۂ مقابلے کے لیے نہ مل سکا۔

اس کا نام حماسہ ہو یا نہ ہو۔ ان میں بعض اب حوادث کے ہاتھوں فنا ہوچکے ہیں اور بعض جو زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں، کتب خانوں کے گوشوں میں پڑے ہوئے ہیں اور اب تک دن کی روشنی کو ترس رہے ہیں۔

حماسۂ أعلم شنتمری:

ابو الحجاج یوسف بن سلیمان بن عیسی الأعلم النحوی الشنتمری (۴۱۰—۴۷۶ھ)[1] نے بھی ایک حماسہ مرتب کیا تھا جو «حماسۂ أعلم شنتمری» کے نام سے مشہور ہے۔ راقم قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہے کہ یہ کوئی مستقل حماسہ ہے یا جس طرح شیخ نائل مرصفی نے کیا ہے[2] شنتمری نے بھی «حماسۂ ابو تمام» کی ترتیب حروف تہجی پر کرکے اس کی شرح کردی ہے جیسا کہ صلاح الدین الصفدی (م ۷۶۴ھ) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے[3]۔

(۱) حالات کے لیے دیکھیے ابن خلکان: وفیات الأعیان (۶: ۷۹)؛ المقری: نفح الطیب (۲: ۴۷۱) شر دوزی؛ ابن بشکوال: الصلة رقم: ۱۳۹۱ (طبع کودیرا)؛ Brockelmann, *GAL* I, 377 نیز دیکھیے Brockelmann کا مقالہ «الأعلم» در دائرة المعارف الإسلامیه (۲: ۳۲۱) جہاں ان کی کئی موجودہ تصانیف کا بھی ذکر ہے۔

(۲) اس کتاب کے دو نسخے دارالکتب المصریہ قاہرہ میں محفوظ ہیں۔

(۳) «شرحَ الحماسة شرحاً مطولاً ورتبَ الحماسة علی کل باب منها علی حروف المعجم» (نکت الهمیان: ۳۱۳)۔ استاذ مکرم پروفیسر عبدالعزیز المیمنی کا بھی یہی خیال ہے: «وحماسة الأعلم الشنتمری وهی حماسة أبی تمام هذه بعد ترتیبها علی الحروف» دیکھیے ان کا مقالہ: «ماذا رأیت بخزائن البلاد الإسلامیة» (حیدر آباد، ۱۳۶۰) ص ۸ جو انہوں نے دائرة المعارف العثمانیه حیدر آباد کی ایک مجلس منعقدہ ۱۳۵۷ میں پڑھا۔

Brockelmann نے الأعلم الشنتمری کے ذکر میں اس کی تصانیف کے ذیل میں «الحماسه» کا اس طرح ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے اس کتاب کا مصنف سمجھتا ہے

ابن خلکان کا خیال یہ ہے کہ الشنتمری نے «الحماسة» کی شرح لکھی تھی جس کا ایک نسخہ ان کے پاس تھا[1].

حاجی خلیفہ نے ان کا ذکر شارح حماسۂ ابو تمام کی حیثیت سے کیا ہے[2]. دارالکتب المصریہ کے فہرست نگار[3] نے حماسۂ ابو تمام کے یک نسخے کا ذکر کیا ہے جو بروایت الأعلم الشنتمری ہے اور جس کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی گئی ہے اس میں سب سے پہلے قیس بن الخطیم کا مندرجہ ذیل مقطوعہ درج ہے:

ثارت علیا والخطیم علم أضع وصیة أشیاخ حملت ازاء ها

یہ نسخہ مغربی خط میں أحمد بن عبداللہ بن سلیمان نے ۵۹۷ ھجری میں لکھا ہے. الشنتمری کتابوں کی شرحیں لکھنے میں خاص دل چسپی رکھتے تھے. ان کی تصانیف میں «شرح دیوان المتنبی»، «شرح الشعراء الستة»، «شرح شواھد کتاب السیبویہ» جس کا نام «تحصیل عین الذھب فی معدن جوھر الأدب فی علم مجازات العرب» ہے. علی الترتیب برلین، پیرس، آکسفورڈ کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں اس لیے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ابو تمام کے «دیوان الحماسة» کی بھی شرح کی ہو لیکن ترتیب بدل دی ہو اور شرح کے ضمن میں کچھ ایسے قطعات کتاب میں نقل کیے ہوں جو حماسۂ ابو تمام میں موجود نہ ہوں. استاذ مکرم مولانا عبدالعزیز المیمنی نے بہت عرصہ ہوا میری توجہ اس بات کی طرف منعطف کرائی تھی کہ اس کا بھی امکان ہے کہ اندلس اور مغرب کے دوسرے حصوں میں «حماسۂ ابوتمام» کی جو روایت پہنچی ہو وہ متداول روایت سے مختلف ہو. عبدالقادر البغدادی (متوفی ۱۰۹۳ ھ) صاحب «خزانة الأدب» نے متعدد مقامات پر اس حماسے

---

(۱) «و غالب ظنی أنه شرح الحماسة فقد كان عندی شرح الحماسة للشنتمری فی خمس مجلدات، و قد غاب عنی الآن من كان مصنفه وأظنه هو والله أعلم، و قد أجاد فيه». وفیات (٦ : ٧٩).

(۲) کشف الظنون ۱ : ٦٩٢ (استانبول، ١٩٤١م)

(۳) الفہرس (۳ : ۸۹)

کا اس طرح ذکر کیا ہے جیسے یہ صرف «حماسۂ ابوتمام» کی شرح نہ ہو، بلکہ خود ایک مستقل کتاب ہو. بعد کو Brockelmann نے البغدادی کی تقلید کی ہے[1].

(۱) ابو زبید الطائی کا یہ شعر:

لیتَ شعری و أین منی لیتٌ   إن «لیتاً» و إنّ «لوآ» عناءُ

نقل کرکے بغدادی لکھتے ہیں[2]:

«البیت من قصیدة لأبی زبید الطائی، أورد منها الأعلم فی باب السیب من حماسته ستة أبیات» اور پھر انھوں نے وہ چھ شعر نقل کردیے ہیں. اگر أعلم الشنتمری نے حماسۂ ابو تمام کی صرف ترتیب درست کی ہوتی تو یہ اشعار جو ابو تمام کے حماسہ میں نہیں ہیں حماسۂ شنتمری میں کہاں سے آجاتے؟

(۲) عصام بن عبیدة الزّمانی کا یہ شعر[3]:

أبلغ أبا مسمعٍ عنی مغلغلةً   و فی العتاب حیاة بین أقوامِ

نقل کرکے لکھا ہے:

«أوردها أبو تمام[4] والأعلم الشنتمری و صاحب الحماسة البصریة[5] فی حماستهم[6]» یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ عبد القادر البغدادی «حماسۂ أعلم الشنتمری» کو «حماسۂ ابو تمام» اور «حماسۂ بصریہ» کی طرح ایک مستقل کتاب اور علیحدہ مجموعہ تصور کرتے ہیں.

---

(۱) «و ذکر عبدالقادر البغدادی «کتاب الحماسة» للأعلم فی مصنفه» (بروکلمان: دائرة المعارف الاسلامیه ۲ : ۳۲۱)

(۲) البغدادی: خزانة الأدب (۳ : ۳۸۲).

(۳) صدرالدین علی البصری: الحماسة البصریه (۲ : ۲۲) مرتبه مختارالدین احمد طبع دائرة المعارف حیدرآباد، ۱۹۶٤

(٤) أبو تمام: الحماسة (۳ : ۷۷)

(٥) الحماسة البصریة (۲ : ۲۲)

(٦) البغدادی: خزانة الأدب (۳ : ۳٤٥)

(۳) اسی طرح دوسری جگہ لکھا ہے[۱]: «أوردها أبو تمام فی الحماسة الحصین بن الحمام و أوردها الأعلم الشنتمری فی حماسته أیضاً» ترتیب بدلنے والے اور شرح کرنے والے کو کسی قطعے یا قصیدے کو حذف کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور اوپر کی عبارت سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ ابوتمام اور أعلم الشنتمری دونوں کے حماسوں میں جو یقیناً علیحدہ علیحدہ اور مستقل کتابیں ہیں یہ قطعہ موجود ہے۔

(٤) ایک جگہ لکھتے ہیں[۲] «هو من أبیات أوردها أبو تمام فی باب المراثی و أوردها الأعلم أیضاً فی حماسته».

(٥) لیس من مات فاستراح بمیّتٍ إنما المیتُ میت الأحیاء[۳]۔

اس پر بغدادی لکھتے ہیں[٤]: «أوردها الأعلم والشریف الحسینی فی حماستیهما»

(٦) لحاف لحاف الصیف والبرد برده ولم یلههی عنه غزال مقنعُ

اس پر بغدادی رقم طراز ہیں: «و کلهم روی هذا الشعر لمسکین[٥] إلا الجاحظ و الأعلم الشنتمری فإنهما نساه إلی کعب بن سعد الغنوی»[٦].

(۱) ایضاً (۳ . ٦۰٥) (۲) ایضاً (۳ : ٦۰٥)

(۳) یہ شعر عدی بن الرعلاء الغسانی کی طرف منسوب ہے۔ (بحتری: الحماسة : ۳۱۱) اور یاقوت الحموی (معجم الأدباء ٤ : ۲٦۹) اس شعر کو صالح بن عبد القدوس کی ملکیت بتاتے ہیں۔ مولانا عبدالعزیز المیمنی بھی یہی خیال ہے دیکھیے سمط اللآلی : ۸ حاشیہ رقم •

(٤) البغدادی: خزانة الأدب (٤ : ۱۸۷)

(٥) صاحب «خزانة الأدب» کا یہ بیان کہ جاحظ اور الشنتمری کے سوا سب لوگوں نے یہ قطعہ مسکین الدارمی کی طرف منسوب کیا ہے، صحت سے دور ہے۔ الحماسة البصریه (۲ : ۲٤۷) میں یہ عقبة بن مسکین الدارمی اور حماسة ابو تمام (٤ : ۱۲۰) میں عتبه بن بجیر کی طرف منسوب ہے اس قطعے کی نسبت عروة بن الورد کی طرف بھی ہے اور اس کے دیوا میں موجود ہے (دیوان رقم . ۱۷). جاحظ اور الشنتمری کے علاوہ شریش نے بھی اسے الغنوی کی طرف منسوب کیا ہے دیکھیے: الشریشی : شرح المقامات (۲ : ۲۳٦) (٦) الخزانة (۲ : ۸۰

(۷) حماسۂ أعلم الشنتمری میں کم از کم ایک باب ایسا بھی ہے جو حماسۂ أبو تمام کیا، کسی حماسے میں موجود نہیں اور وہ آخری باب، «باب القصر و الکبر» ہے ، یوں بھی اس کتاب میں ایسے زیادات ہیں جن کا حماسۂ ابو تمام میں پتا نہیں۔

بہر حال اصل کتاب کے مطالعہ کے بغیر یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے ، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر الشنتمری نے «حماسۂ ابو تمام» کی صرف شرح کی ہوتی یا ترتیب بدلی ہوتی تو بغدادی اس کا ذکر کہیں تو کرتے۔ الشنتمری کا حماسہ ان کی نظر سے گزرا ہے ، اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے حوالے دینے میں وہ مجموعی انداز ایسا اختیار کرتے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ اسے «حماسۂ ابو تمام» سے علحدہ ایک مستقل کتاب سمجھتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ الشنتمری کے پیش نظر «حماسۂ ابو تمام» رہی ہو اور اس سے اس نے بہت فائدہ اٹھایا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس میں حماسۂ شنتمری کی کیا تخصیص ہے تقریباً سارے حماسوں میں «حماسۂ ابو تمام» کے قطعات موجود ہیں۔

اس حماسے کا ایک بہت قدیم ، صحیح ، اور اہم نسخہ[1] دارالکتب المصریہ قاہرہ (ادب : ۹٤) میں موجود ہے جس کی کتابت ۵۹۷ ھ میں ہوئی ہے۔ خیر الدین الزرکلی نے الشنتمری کے «شرح دیوان الحماسۃ» کے ایک نسخے کا پتا بتایا ہے جس کی کتابت ۵۱۳-۵۱٤ ھ میں ہوئی ہے اور کتب خانۂ احمدیہ تیونس میں محفوظ ہے[2]۔ حماسۂ شنتمری کی ایک شرح کا بھی پتا چلا ہے[3] یہ بارھویں صدی ہجری کے ایک مغربی عالم ابن را کور[4] الفاسی (م ۱۱۲۰ ھ) نے «شرح الحماسۃ الشنتمری» کے نام سے دو جلدوں میں کی ہے جس کا ایک ناقص الطرفین نسخہ خط مغربی میں امیر طاہر الجزائری،حفید امیر

---

(۱) فہرس دارالکتب المصریۃ (٤ : ۸۹) قاہرہ، ۱۹۲۷م

(۲) الزرکلی : الأعلام (۹ : ۳۰۸)

(۳) عبدالعزیز المیمنی : یادداشت سیاحت ممالک اسلامیہ (قلمی)۔

(٤) Brockelmann, GAL Suppl. II, 686

عبد القادر الجزائری کے کتب خانۂ دمشق میں موجود ہے۔ یہ نسخہ استاذ المیمنی کی نظر سے بھی گذر چکا ہے[۱]۔ غالباً خود الشنتمری نے بھی ایسے حماسے کی شرح لکھی تھی۔

الحماسة للشاطبی

اس حماسے کے مؤلف ابو عامر محمد بن یحییٰ بن خلیفة بن ینّق الشاطبی الأندلسی النحوی (۴۸۲ھ—۵۴۷ھ) ہیں[۲] یہ اندلسی ادیب ہیں اور شاطبہ کے رہنے والے ان کی تصانیف میں «ملوک الأندلس و الأعیان والشعراء بھا» ، «مجموعة خطب» اور «الحماسة» ہیں۔ آخر الذکر کتاب کے کسی نسخے کی اطلاع نہیں ملی ہے اور نہ کسی ادبی کتاب میں اس کا حوالہ نظر سے گزرا

الحماسة للشمیم الحلی۔

مصنف ابوالحسن علی بن الحسن بن عنتر بن ثابت النحوی اللغوی متوفی ۶۰۱ھ جو شمیم الحلی کے نام سے مشہور ہیں[۳]۔

یاقوت الحموی، مصنف سے ۵۹۴ھ میں ملا تھا، وہ کہتا ہے کہ ابو تمام کے حماسے کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا۔ ابو تمام نے تو اپنے حماسے میں سارے شعرائے عرب کے اشعار جمع کردیے ہیں لیکن میں نے تو صرف اپنے اشعار سے ایک پورا حماسہ تیار کردیا ہے۔ وزیر جمال الدین ابن القفطی نے بھی تفصیل سے اس کے حالات لکھے ہیں اور اس کے حماسے کا ذکر کیا ہے۔ حاجی خلیفہ کے یہاں بھی اس حماسے کا ذکر ملتا ہے اس سے

(۱) عبدالعزیز المیمنی : ماذا رأیت حزائن البلاد الإسلامیه : ۹

(۲) حالات کے لیے دیکھیے : ابن الأبار : التکملة ۱۹۸؛ سیوطی: بغیة الوعاة : ۱۱۲؛ فتح بن خاقان : قلائد العقیان : ۱۸۶؛ البغدادی : إیضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون (۱ : ۴۲۱) اور الأعلام (۸ : ۷)۔

(۳) ان کے حالات معجم الأدباء (۵ : ۱۳۰)؛ ابن العماد: شذرات الذهب (۵ : ۴)؛ وفیات الأعیان (۳ : ۲۶)؛ القفطی: إنباه الرواة (۲ : ۲۴۳) تحقیق محمد ابوالفضل ابراهیم (قاهره: ۱۹۵۲) دیکھنا چاهیے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حماسہ ۱٤ ابواب پر مشتمل تھا[1]. تعجب نہیں ابواب بعینہ وہی ہوں جو ابو تمام کے یہاں ہیں. ابن خلکان نے لکھا ہے[2] کہ اس حماسے میں دس ابواب تھے[3].

الحماسة المغربیه :

اس کے مصنف جمال الدین ابو الحجاج یوسف بن محمد بن ابراهیم الأنصاری البیاسی الأندلسی متوفی ٦٥٣ ھ ہیں[4]. ان کی ولادت بیاس (اندلس) ٥٧٣ ھ میں ہوئی، موصوف اندلس کے مشہور عالموں میں تھے، نظم و نثر پر بڑی بھر پور قدرت رکھتے تھے. عرب کی تاریخ، وقائع و ایام پر بڑی گہری نظر تھی. صاحب افریقه کے لیے ایک کتاب « الإعلام بالحروب الواقعة فی صدر الإسلام » لکھی تھی جس میں حضرت عمر فاروق کی شہادت سے ہارون الرشید کے عہد تک کے واقعات درج ہیں[5]. « شرح رسالة ابن حریق » (ابن حریق[6] کے حاشیہ بر « الجمل » الزجاجی کی شرح ہے).

---

(۱) کشف الظنون (۳ : ۱۱٦)

(۲) وفیات الأعیان (۳ : ۲٦)

(۳) اس مصنف کی ایک دوسری کتاب « الأنیس فی غرر التجنیس » کا بھی پتا چلا ہے. اس کا ایک نسخه دار الکتب المصریه میں موجود ہے (الفہرس ٤ : ۲۹) « کشف الظنون » میں اس کا نام « أنیس الجلیس فی التجنیس » ہے.

(٤) حالات کے لیے دیکھیے ابن خلکان : وفیات الأعیان (٦ : ۲۳٦) طبعة محی الدین عبدالحمید؛ مقری : نفح الطیب (۲ : ۲۱۳)؛ ابن العماد : شذرات الذهب (٥ : ۲٦۲)؛ Brockelmann, *GAL* 1, 124, Suppl 1, 588

(٥) ابن خلکان لکھتے ہیں « رأیت هذا الکتاب فطالعته و هو فی مجلدین أجاد فی تصنیفه » (وفیات ٦ : ۲۳٦). اس کا ایک نسخه دار الکتب المصریه میں محفوظ ہے (الفہرس ٥ : ۳۳) مزید دیکھیے :

Horovitz, *Mitteilungen der Seminars fur Orientalische Sprachen* Vol. X p. 22

(٦) (متوفی سنه ٦۲۲ ھ) حالات کے لیے دیکھیے : ابن الزبیر الغرناطی : صلة الصلة رقم : ٦٦۳، اس کتاب کا ایک نسخه مکتبة الزاویة الحمزیة، تطوان (مغرب) میں محفوظ ہے.

اور «تذکرۃ العاقل و تنبیہ الغافل»[1] کے علاوہ انہوں نے متقدمین و متأخرین شعراء کے کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا جو «الحماسۃ المغربیہ» کے نام سے مشہور ہے اور چونکہ بیاس ان کا وطن ہے اس لیے اس مناسبت سے ان کے حماسے کا نام «الحماسۃ البیاسیۃ» بھی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے[2] جس کی تصنیف تیونس میں (شوال ٦٤٦ھ میں) ہوئی، اس میں «حماسۂ ابوتمام» کے طرز پر جاہلی، مخضرم، اسلامی مولدین اور مشرق اور اندلس کے محدثین شعراء کے بہترین اشعار انتخاب کرکے جمع کیے ہیں، اس میں اندلس کے شعراء کا بھی کلام درج ہے[3]۔ ابن خلکان کی نظر سے یہ حماسہ گزرا تھا اور دو تین مقامات پر اس سے اس کا ذکر بھی کیا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہے[4]۔ ابن العماد بھی اس کتاب سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتا ہے[5]۔

(۱) وفیات الأعیان (۲ . ۳۲٦) اس خلکان نے نام «تذکیر العاقل» اور «تذکرۃ العاقل» دونوں لکھا ہے اور اس سے کئی مقامات پر استفادہ کیا ہے اور کتاب کی طویل عبارتیں بھی نقل کی ہیں دیکھیے (٦ : ١١٦) اور (٦ : ١٢٧) .

(۲) کشف الظنون (۳ : ١١٦)، ابن العماد نے بھی دو جلدوں کا ذکر کیا ہے شذرات (٥ : ٢٦٢).

(۳) کشف الظنون (۱ : ٦٩٢) طبع استانبول .

(٤) ابن الیبانۃ کے ذکر میں ابن خلکان لکھتے ہیں : «ورأیت فی کتاب الحماسۃ التی صنفها یوسف البیاسی» (۲ : ۳٥)، پھر ابو یعقوب یوسف بن عبد المؤمن کے ترجمے میں لکھتے ہیں : «و قال البیاسی فی حماسته» (۲ : ۲۷۳). البیاسی کے ترجمے میں وہ لکھتے ہیں : «و رأیت له أیضاً کتاب الحماسة فی مجلدین و قد قرئت النسخة علیه و علیها خطه، کتبه فی أواخر شهر ربیع الآخر سنة خمسین و ستمائة، و قال فی آخر الکتاب : و کان الفراغ من تألیفه و ترتیبه بمدینة تونس، حرسها الله تعالی فی شوال سنة ستّ و أربعین وستّ مائة».

(٥) ابن العماد : شذرات الذهب (٥ : ٢٦٢) . ابن خلکان نے اس حماسے کی تمہید اور مختلف ابواب سے کچھ قطعات نمونے کے طور پر کئی صفحوں میں درج بھی کیے ہیں ۔ وفیات الأعیان (٦ : ٢٣٦)، (٦ : ٢٣٧-٢٤١).

اس حماسے کا ایک مکمل نسخہ جس میں ابو تمام ، بحتری ، ابن السید البطلیوسی کا بھی خاصہ کلام موجود ہے کتب خانۂ سلطان محمد فاتح استانبول میں موجود ہے اس کا خط مغربی ہے اوراق ۱۰۹ سطور فی صفحہ ۲۵ مکتوبہ ۶۱۸ھ[1] اس کتاب کے کچھ اجزا کتب خانۂ گوتھا (مشرقی جرمنی) میں بھی محفوظ ہیں[2].

التذکرۃ السعدیۃ :

اس کے مؤلف محمد بن عبدالرحمن بن عبدالمجید العبیدی[3] ہیں جو کم از کم ۷۰۲ھ تک ضرور زندہ تھے . یہ جاہلی ، اسلامی ، مخضرمی اور مؤلف کے عہد تک کے متأخرین شعراء کے کلام کا نہایت نفیس انتخاب ہے . اصل مأخذ یہ تین حماسے ہیں : « حماسۂ ابو تمام » ، « حماسۂ ابن فارس » اور « حماسۂ ابو ہلال العسکری » اس کے علاوہ محدثین میں مؤلف نے ابو نواس ، زہیر المصری وغیرہ کے اشعار کا اضافہ کیا ہے . اس کتاب میں یزید بن معاویہ کے بہت سے اشعار ملتے ہیں .

کتاب مندرجہ ذیل ۱۴ ابواب پر مشتمل ہے :

۱ـ الحماسۃ والافتخار ، ۲ـ الأدب والحکم والأمثال ، ۳ـ النسیب ، ۴ـ المدح والإستجداء والإستعطاف و التقاضی ، ۵ـ المراثی ، ۶ـ الهجاء

---

(۱) کتاب خانۂ فاتح رقم : ۴۰۷۹ اس پر ایک مضمون *MFO* Vol. v, p. 505 میں شائع ہوا ہے . اسی نسخے کے حاشیے پر « صفوۃ الأدب » جس کا ذکر آگے آرہا ہے درج ہے .

(۲) گوتھا رقم : ۱۲ دیکھیے دیباچہ حماسۂ بحتری از لویس شیخو؛ بروکلمان : تأریخ الأدب العربی (۱ : ۸۲)

(۳) Brockelmann نے کتاب کا پورا نام « التذکرۃ السعدیۃ فی الأشعار العنبیہ » لکھا ہے . مصنف کے متعلق اس کے پاس بالکل معلومات نہیں اس نے صرف مصنف کا نام لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے *GAL* Suppl, ii, p. 901 اس کتاب پر ایک مضمون کا حوالہ بھی یہاں درج ہے جو *WZKM* Vol. XXVI p. 81 میں شائع ہوا ہے .

۷۔ الأخوانیات ، ۸۔ التهانی ، ۹۔ الإعتذار ، ۱۰۔ الصفات ،
۱۱۔ المعاتبات والشماتة من حوادث الزمان و الصبر علیها ، ۱۲۔ الملح ،
۱۳۔ الأشیاء المتفرقة ، ۱۴۔ الدعاء .

مؤلف کا طریقۂ کار یہ ھے کہ ہر باب میں وہ سب سے پہلے «حماسۂ ابو تمام» سے اپنے پسندیدہ قطعات نقل کرتے ھیں، اس کے بعد ابو ھلال العسکری اور ابن فارس اللغوی کے حماسوں سے اشعار کا انتخاب دیتے ھیں ، اس کے بعد اس باب میں ابو تمام ، بحتری اور متنبی کے اشعار اور پھر آخر میں اپنے عہد تک کے دوسرے شعراء کا انتخاب کلام درج کرتے ھیں.

یہ کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ھے اور شائع کرنے قابل ھے اس لیے کہ اس کے اہم مأخذوں میں دو کتابیں « حماسۂ عسکری » اور « حماسۂ ابن فارس » کا آج وجود نہیں ، اس کے علاوہ یہ صرف ان دونوں حماسوں کا خلاصہ یا انتخاب نہیں بلکہ خود مؤلف نے اپنے زمانہ تک کے شعراء کے اشعار بڑی تلاش و جستجو سے جمع کیے ھیں ، اور بعض نئے ابواب کا اضافہ بھی کیا ھے . اس کتاب کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکتوبہ ۷۰۲ ھ چھوٹی تقطیع کے ۲۴۰ اوراق (سطور : ۱۷) پر ایاصوفیہ (استانبول) کے کتب خانے میں محفوظ ھے ، رقم : ۳۸۲۱[1].

صفوة الأدب و دیوان العرب .

مصنف ابو العباس أحمد بن عبد السلام الکورانی ھیں[2]. موصوف کو متقدمین اور متأخرین کے اشعار کثرت سے یاد تھے ، انھوں نے ایک مجموعہ « حماسۂ ابو تمام » کی وضع پر ترتیب دیا ھے . ابن خلکان کے عہد میں یہ

(۱) عبد العزیز المیمنی : یادداشت سیاحت ممالک اسلامیہ . (قلمی)
(۲) Brockelmann نے صرف کتاب اور مصنف کا نام درج کردیا ھے حالات اور نسخے کی تفصیلات پیش نہیں کی ھیں ہاں یہ لکھا ھے کہ کتاب خانۂ فاتح میں اس کتاب کا اختصار موجود ھے GAL Suppl II, p 916
اس نسخے پر ایک مضمون MFO, Vol. V, p 505 میں شایع ہوا ھے .

کتاب عام تھی. وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اہل مغرب میں اُسی طرح مقبول تھی جسطرح «حماسۂ ابو تمام» مشرق میں. وہ اس مجموعے کے حسن ترتیب و انتخاب کے معترف ہیں[1] . مصنف نے یہ مجموعہ یعقوب بن یوسف بن عبد المؤمن القیسی الکوفی صاحب بلاد المغرب (متوفی ۵۹۵ھ)[2] کے نام معنون کیا تھا[3]. مصنف چھٹی صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنے حماسے میں اپنے زمانہ تک کے شعراء کے اشعار درج کیے ہیں یہ کتاب، «الحماسة المغربیه» نسخۂ کتاب خانۂ سلطان محمد فاتح (رقم ۴۰۷۹) کے حاشیے پر منقول ہے. اس نسخے کا خط مغربی ہے، تعداد اوراق ۱۰۹ سطور ۱۷ اور سال کتابت ۶۱۸ھ ہے[4].

حماسۂ أبو هلال العسکری :

عربی زبان کے مشہور مصنف أبو هلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) کی تالیف ہے. اس کا ذکر بدر الدین عینی[5] اور حاجی خلیفه[6] نے کیا ہے. صاحب «مجموعة المعانی» کو یہ کتاب ملی تھی اور اس سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا تھا[7] .

---

(۱) «جمع کتاباً یحتوی علی فنون الشعر علی وضع «الحماسه» لأبی تمام الطائی، و سماه «صفوة الأدب و دیوان العرب» و هو کثیر الوجود بأیدی النـاس، و هو عند أهل المغرب کالحمـاسة عند أهل المشرق» (وفیـات الأعیـان ۲ : ۳۷۵ ، ۶ : ۱۳۶ طبعة محی الدین عبدالحمید)

(۲) وفیات الأعیان (۶ : ۴) ؛ نفح الطیب (۲ : ۷۳۸) ؛ (۲ : ۱۱۸۸)؛ الأعلام (۹ : ۲۶۷) .

(۳) « وله ألف ابو العباس أحمد بن عبد السلام الجراوی کتابه الذی سماه « صفوة الأدب و دیوان العرب » فی مختار الشعر و هو مجموع ملیح أحسن فی اختیاره کل الإحسان» (وفیات الأعیان ۲ : ۲۲۸) .

(۴) عبد العزیز المیمنی : یاد داشت سیاحت ممالک اسلامیه (قلمی). اس نسخے پر ایک مضمون *MFO* Vol. v. p. 505 میں شائع ہوا ہے .

(۵) العینی : شرح شواهد المغنی (۴ : ۵۹۸).

(۶) کشف الظنون (۳ : ۱۱۶) طبع فلوگل، (۱ : ۶۹۳) طبع استانبول.

(۷) « کذا رواه أبو هلال العسکری فی کتابه الحماسة الذی جمعه» (مجموعة المعانی : ۱۱۳) .

یہ کتاب، «التذکرة السعدیة» کے بہت اہم مأخذوں میں ہے اور اس میں بہت سے مدرجات و معلومات «حماسة ابو هلال» سے ماخوذ ہیں۔

الحماسة المحدثة لابن فارس

یہ أحمد بن فارس بن زکریا اللغوی متوفی ۳۶۹ھ[1] کی اس قدر اهم کتابوں میں ہے کہ ابن ندیم[2] نے اس کتاب کے علاوہ، اس کی کسی اور تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ اس میں قدماء کے کلام سے صرف نظر کر کے متأخرین کے اشعار کے انتخاب کی طرف توجه کی گئی ہے، اس حماسے کا ذکر یاقوت الحموی[3] نے بھی کیا ہے، متأخرین کے یہاں جو اس کتاب کا ذکر ملتا ہے[4]، اس کا مأخذ غالباً «معجم الأدباء» ہی ہے۔ «تذکرة السعدیة»

(۱) حالات کے لیے دیکھیے: ابن خلکان: وفیات (۱: ۱۰۰) نشر محی الدین عبدالحمید، یاقوت الحموی، معجم الأدباء (٤: ۸۰ - ۹۸) طبع الرفاعی؛ الزرکلی، الأعلام (۱، ۱۸٤) دوسرا ایڈیشن؛ عمر رضا کحالة: معجم المؤلفین (۲: ٤۰) جہاں ان بہت سے مصادر کا ذکر ہے جن میں ابن فارس کے حالات ملتے ہیں۔ نیز دیکھیے محمد بن شنب کا مقالہ «ابن فارس» در دائرة المعارف الاسلامیه (۱: ۲٤۷)؛ اور «الصاحبی» اور «مقائیس اللغة» کے تنقیدی ایڈیشن کے مقدمے جو علی الترتیب محب الدین الخطیب اور الأستاذ عبد السلام محمد هارون کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۲) ابن الندیم الفهرست: ۸۰

(۳) یاقوت الحموی: معجم الأدباء (۲. ۸) طبع مارگولیتھ، (٤: ۸۰) طبع الرفاعی یاقوت نے اس کا نام «کتاب الحماسة المحدثة» لکھا ہے۔ ابن فارس کا وہ طویل مکتوب جو اس نے ابو عمرو محمد بن سعید الکاتب کو لکھا ہے «حماسات المحدثة» کے متعلق اس کے نظریے کی وضاحت کرتا ہے، الثعالبی کی «یتیمة الدهر» (۲: ۲۱٤ - ۲۱۸) میں موجود ہے، وہیں سے الاستاذ محمد عبد السلام هارون نے «مقائیس اللغة» (مقدمة الناشر: ۱۵ - ۲۰) میں اور محب الدین الخطیب نے «الصاحبی» کے مقدمے میں نقل کیا ہے۔

(٤) اسماعیل پاشا: ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون (۱: ٤۲)

کے اہم مأخذوں میں یہ کتاب بھی رہی ہے ۔ اس کا ، (یا حماسۃ ابو تمام، شرح ابن فارس کا ؟) ایک نسخہ کتب خانۂ مشہد ایران، میں موجود ہے[1] ۔

حماسۃ ابن المرزبان :

ابوبکر (یا ابو العباس) محمد بن خلف المرزبان الدمیری البغدادی،[2] اس کے مؤلف ہیں جو زبیر بن بکار (متوفی۲۵۶ھ) اور الرّمادی (متوفی۲۶۵ھ) کے شاگرد ہیں ۔ ان کے تلامذہ میں ابو عمر و بن حیوۃ قابل ذکر ہیں ۔ ابن المرزبان کا سال وفات ۳۰۹ھ ہے ۔ ان کے حماسے کا ذکر صرف یاقوت الحموی کے یہاں دیکھنے میں آیا[3] ۔ یاقوت کے علاوہ کوئی اور مصنف اس کتاب کا ذکر نہیں کرتا ۔ ان کی تصانیف میں « وصف الفارس » ؛ « وصف السیف » ، اور « وصف القلم » کا ذکر ملتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے پچاس سے زائد کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں ۔ ان کی پانچ کتابوں کا ذکر Brockelmann نے کیا ہے جن میں تین کتابیں مخطوطے کی شکل میں اب بھی محفوظ ہیں ۔ « تفضیل الکلاب » قاہرہ سے ۱۳٤۱ میں شائع ہوچکی ہے[4] ۔

حماسۃ خالدّیین :

کتاب کا اصل نام « الأشباہ و النظائر من شعراء المتقدمین و الجاہلیة و المخضرمین» ہے جو « حماسۃ الخالدّیین » کے نام سے مشہور ہے جسے اعمالِ موصل کے ایک قریہ « خالدّیہ » کے رہنے والے دو بھائیوں ، ابوبکر محمد اور ابو عثمان سعید نے مل کر مرتب کیا ہے ۔ اکثر ادبی

(۱) فہرست کتاب خانۂ مشہد، ایران (۳ : ٦) تہران ۱۳٤۵ھ.

(۲) السیوطی : بغیة الوعاة : ۱۰۳ ؛ حاجی خلیفہ : کشف الظنون (۲ : ۲۰۱۳) طبع استانبول؛ کحالہ معجم المؤلفین (۱۲ : ۱۳) ؛ یاقوت : معجم الادباء (۱۹ : ۵۲)؛ الخطیب البغدادی : تأریخ بغداد (۵ : ۲۳۷) .

(۳) معجم الأدباء (۷ : ۱۰۵) الجزء المنحول .

(٤) بروکلمان : تاریخ الأدب العربی (۲ : ۲۳۹) مترجمہ الدکتور عبدالحلیم النجار (دار المعارف ، مصر).

و علمی کام دونوں بھائیوں نے مل کر کیے اور ان کی ساری تصانیف پر دونوں کے نام درج رہے۔ ان کے سالہاے ولادت و وفات کے متعلق قطعی طور پر کچھ معلوم نہیں، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ دونوں بھائی چوتھی صدی ہجری کے ربع اول کے بعض مصنفین و رواۃ ابن الخیاط النحوی (م ۳۲۰ھ) ابن درید (م ۳۲۱ ھ) جحظۃ البرمکی (م ۳۲٤ھ) النوبختی (م ۳۲۷ھ)، قدامۃ بن جعفر (م ۳۳۷ھ) الصولی (م ۳۳۵ھ) اور التنوخی (م۳۸۳ ھ) وغیرہم سے روایتیں نقل کرتے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں بھائی تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے پہلے عشرے میں پیدا ہوتے ہوں گے۔ ابوبکر، اپنے بھائی ابو عثمان سے عمر میں بڑے تھے ان کی وفات ۳۸۰ ھ میں ہوئی۔ ابو عثمان کے سال وفات میں اختلاف ہے Brockelmann نے ۳۵۰ ھ اور یاقوت الحموی نے ۳۷۱ھ لکھا ہے یہ تاریخیں صحیح نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے کہ ۳۸۰ ھ تک ان کا زندہ رہنا ثابت ہے، ابن شاکر الکتبی نے «فی حدود الأربع مائۃ» لکھا ہے[1]۔ قیاس غالب ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے عشرۂ دہم میں ان کی وفات ہوئی ہوگی[2]۔

«الأشباہ والنظائر» کی ترتیب دوسرے حماسوں اور اس قسم کے مجموعوں سے مختلف ہے اس کا پہلا باب، «باب الحماسۃ» بھی نہیں. اور یہ مجموعہ عنوانات کے تحت صرف شعروں کا انتخاب بھی نہیں جیسا کہ دوسرے حماسوں کے مرتبین کا معمول ہے بلکہ مؤلفین نے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ کچھ اشعار لکھ کر ان شعروں کے ہم معنی شعر پیش کرتے ہیں اور پھر اس پر گفتگو کرتے ہیں، شعراء کے کلام پر موازنہ کرتے ہیں اور پھر ہر شعر کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ شاعر نے یہ مضمون کہاں سے لیا ہے اورکن کن شعراء سے وہ مستفید ہوا ہے، شجاعت و بسالت کا ذکر آیا تو اس مضمون کے بہترین اشعار جمع

(۱) GAL Suppl. i, 41، معجم الأدباء (۱۱ : ۲۰۸)، فوات الوفیات (۱ : ۳۵۰)۔

(۲) الدکتور سامی الدهان نے سال وفات ۳۹۰ ہجری لکھا ہے۔ (مقدمۃ التحف والهدایا)

کردیں گے ، کسی کے هجویه اشعار یاد آگئے تو کثرت سے سپرد قلم کریں گے ۔ مراثی کے مضمون پر اسی قسم کے شعر درج کریں گے ، نسیب کا ذکر ہے تو ویسے ہی اشعار انتخاب کرکے لائیں گے اور اس طرح ہمیں «باب الحماسة» ، «باب الهجاء» ، «باب المراثی» ، «باب النسیب» کا لطف آجاتا ہے ۔ کہیں پر شرح کی ضرورت پڑی تو شرح شروع ہوجائے گی ، تلمیح یا کوئی قصه طلب بات سامنے آگئی تو اس کا بیان ہونے لگا ، کسی لڑائی کا نام آیا تو ایام عرب کے دفتر کھلنے لگے ، «ابن الدُّمینة» کے شعر پسند آگئے تو اس کا دیوان کھڑا کردیا ، انہی وجوہ سے لوگ اس کتاب کو حماسوں میں شمار نہیں کرتے ۔ لیکن اصل یه ہے که ان مصنفین نے حماسه ترتیب دینے کی ایک نئی راہ نکالی ہے اور پرانے طریقے کو خیر باد کہہ دیا ہے ۔ سابق حماسوں میں مؤلف ، صرف اشعار منتخب کردیتا تھا ، اس کی اپنی رائے کا پتا نہیں چلتا تھا ، اشعار کی تشریح نہیں ہوتی تھی ، تلمیحوں اور شرح طلب رموز و نکات کا بھید نہیں کھلتا تھا ، اس کمی کو انہوں نے محسوس کرکے اس پر پوری توجه دی ہے اور اپنے مجموعے کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے ۔

«الأشباه» کے نسخے کتب خانۂ عاشر آفندی ، (استانبول) رقم : ۹۷۱ مکتوبه ۶۰۳ ھ، کتب خانۂ اسعد آفندی سلیمانیه رقم : ۲۹۳۳ اور دارالکتب المصریه رقم : ۱۷۰۹ میں محفوظ ہیں ۔ اس کی پہلی جلد ڈاکٹر سید محمد یوسف نے ۱۹۵۸ء میں قاہرہ سے شایع کردی ہے ۔

الحماسة البصرية :

مطبوعه حماسوں کے علاوہ ، ان حماسوں میں جو ابھی تک منظرعام پر نہیں آئے ہیں ، سب سے زیادہ اہمیت «الحماسة البصریه» کی ہے اس کا مصنف غیر معروف سہی ، لیکن کتاب گم نام نہیں ، قدیم علماء نے جس قدر اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور دور حاضر کے مستشرقین اور دوسرے محققین نے جس قدر حوالے اس حماسے کے دیے ہیں اتنے کسی غیر

(۱) المختار من شعر ابن الدمینة ؛ تحقیق مختار الدین أحمد مقدمه : ۱۳ ـ ۱٤

مطبوعہ حماسہ کے دیکھنے میں نہیں آئے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ «حما
ابو تمام» کے بعد یہ دوسرا مشہور حماسہ ہے جسے دیسا جاتی ہے ا
جس سے علماء کثرت سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا ۔ قدماء میں
ابن شاکر الکتبی (م۷٦٤ھ)[1]، عبد القادر البغدادی (م ۱۰۹۳ھ)[2]، بدرالدین العینی
(م ۸۵۵ ھ)[3]، جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ ھ)[4]، ابن الأکفانی (متوفی ۷٤۹ ھ
اور خضر الموصلی[6] (م۱۰۰۷ھ) نے اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیے ہیں
عصر حاضر کے بچاسوں علماء نے تخریجات و اختلاف روایات کے لئے
اپنی کتابوں میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور انہیں اس کتاب سے بڑی مدد
ملی ہے جن اصحاب کے لیے یہ کتاب لکھی گئی اور جن کے نام معنون
کی گئی ہے وہ بڑی جلیل القدر ہستیاں تھیں ، اسی طرح جن لوگوں
اس کتاب پر تقریظات لکھی ہیں . ان کی علمی اہمیت بھی مسلم ہے

«الحماسة البصرية» کے مؤلف صدر الدین علی بن أبی الفرج البصری
نے سب سے پہلے اس مجموعے کو ٦٤٧ ھ میں مرتب کیا اور الملک الناصر

(۱) الکتبی عیون الأخبار (حوادث ۲۸۰م) نسخۂ کتاب خانۂ ماربرگ ، جر
(۲) خزانة الأدب میں ذیل کے مقامات پر «الحماسة البصرية» کا ذکر
آیا ہے . ۱ : ۱۰ ، ۱۵۰ ، ۳۵٦ ، ٤۵۵ ، ٤۹۲ ، ۲ ، ۳٦۹ ، ۵٤٤ـ۳ : ۱ :
۳٤۵ ـ ۳۵۱ ، ۵٦۵ ، ٤ . ۵۲۳ ، ۵۸۹ . (المیمنی : إقليد الخزانة)
(۳) العینی المقاصد النحوية فی شرح شواهد شروح الألفية ۲ : ۲۳۵ ، ۳ :
(٤) السیوطی . شرح شواهد المغنی . ۲۲ ، ۳۱ ، ٦۲ ، ١٦٤ ، ۵۵
۱۷۵ ، ۱۸۸ ، ۲٤۱ ، ۳۲۰ .
(۵) ابن الأکفانی . إرشاد القاصد إلى أسنى المقاصد : ۲۲ ، اس حو
کے لیے میں پروفیسر Tritton A S کا ممنون ہوں . مصنف کا نام محمد بن إبرا
بن ساعد المصری الأنصاری ہے (Brockelmann, *GAL* Suppl II, 169) یہ کتاب قاہرہ
۱۹۰۰ ھ میں شایع ہوچکی ہے .
(٦) خضر بن عطاءالله الموصلی : کتاب الإسعاف (نسخۂ کتب خانۂ خدابخش
بانکی پور) میں متعدد مقامات پر الحماسة البصریہ کا ذکر ہے . اس کتاب کا
نام «کتاب الإسعاف فی شرح شواهد القاضی والکشاف» ہے . *GAL* I, 509

صلاح الدنیا والدین ابو المظفر یوسف بن الملک العزیز بن الملک الظاہر »
کے نام معنون کیا، بعد میں ایک مدت تک اس میں ترمیم و اضافے کا
عمل جاری رہا، اب کی مؤلف نے تمہید میں خلیفۂ عباسی المستعصم باللہ کے
نام کا بھی اضافہ کردیا، یہ عمل کب ہوا اس کے متعلق کچھ نہیں کہا
جاسکتا، لیکن یہ تبدیلی اس قدر گہری تھی کہ اب کتاب بہت حد تک
بدل گئی ہے، پہلے یہ کتاب صرف ایک جلد پر مشتمل تھی اب اسے
مؤلف نے دو جلدوں میں تقسیم کردیا، قطعات کی تعداد میں بھی بہت کچھ
اضافے کیے، گو کہیں کہیں سے بعض قطعات نکال بھی دیے. پہلی روایت،
مصنف کے کام کی ابتدا تھی اس لیے اس میں اسقام خاصے نظر آتے ہیں،
بہت سے ضروری اور اہم قطعے غائب تھے، درج شدہ قطعوں میں بھی بہت
سے قابل انتخاب اشعار چھوڑ دیے تھے، شاعروں کی طرف انتساب بھی
کہیں کہیں غلط تھا، کوئی قطعہ اگر کئی شاعروں کی طرف منسوب ہے
تو پہلے صرف ایک شاعر کا نام وہاں درج تھا. اب دوسری روایت میں کہیں
کہیں دوسرے شعراء کے نام بھی درج کردیے ہیں، اس میں ابواب بھی کم تھے
اب اس میں بھی اضافہ کردیا ہے، غرض کہ مصنف نے دوسری روایت میں
جو زیادہ مکمل ہے ساری کمیوں کو پوری کرنے اور دوسرے نقائص کو
دور کرنے کی کوشش کی ہے. اس لیے آخری روایت ہی اصل کتاب
ہے اور اسی کو مصنف نے بھی مستند سمجھا اور یہی روایت تمام دنیا میں
اس وقت شائع اور مروج ہے.

مصنف:

ہمارا مصنف اس قدر گم نام ہے کہ تاریخ و تذکرے کی کسی
کتاب میں اس کے حالات دیکھنے میں نہیں آئے. یہ بات افسوس ناک
بھی ہے اور حیرت انگیز بھی، علمائے سیر و تواریخ نے تو ایسے اشخاص تک
کے حالات محفوظ کردیے ہیں جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں، ہمارے
مصنف نے تو دو کتابیں بھی لکھی ہیں اور اپنے زمانے میں اسکی اپنی
اہمیت کم نہ تھی، وہ امراء و ملوک کا پرپروردہ تھا، اس نے متعدد سلاطین

و وزرا کا زمانہ پایا اور ان سے ان کے تعلقات رہے ، اگر صلاح الدین ابو المظفر یوسف بن الملک العزیز (٦٢٧ ـ ٦٥٩ ھ) حلب کا امیر اور الملک الظاہر رکن الدین بیبرس البجمی البند قداری (٦٥٨ ـ ٦٧٢ ھ) مصر کا بادشاہ تھا ، تو المستعصم باللہ (٦٠٩ ـ ٦٥٦ ھ) خلافت عباسیہ کا خاتم اور آخری جانشین . اس کی کتاب کے تقریظ نگاروں میں السلطان الملک الناصر داؤد بن عیسیٰ بن عیسیٰ بن أبی بکر بن ایوب (٦٠٣ ـ ٦٥٦ ھ) بادشاہ تھا تو مؤید الدین إبراھیم بن القمطی (٥٩٤ ـ ٦٥٨ ھ) وزیر ، پھر اس عہد کے مشہور علماء و مؤرخین : ابن العدیم (٥٨٦ - ٦٦٠ ھ) ، کمال الدین محمد بن طلحة الشافعی (٥٨٢ ـ ٦٥٢ھ) ، شہاب الدین یحیی بن محمد بن القیسرانی (م؟) ، ابن مالک النحوی (٦٠٠ ـ ٦٧٢ھ) ، ابن عمرون (٥٩٦ ـ ٦٤٩ھ) وغیرھم سے اس کے ذاتی تعلقات تھے . مصنف کا زمانہ وہ ہے جس میں مؤرخین اسلام نے مشہور تاریخی کتابیں لکھیں ، ساتویں اور آٹھویں صدی ھجری میں متعدد تاریخی تذکرے مرتب ہوئے اور ان کی ذیلیں لکھی گئیں . لیکن یہ سب صدرالدین علی کے ذکر سے خالی ہیں . یہی نہیں کہ اس کے معاصرین نے بے اعتنائی کی ، بلکہ بعد کے مؤرخین نے بھی اسے درخور اعتنا نہ سمجھا ، ابن خلکان اور بعض دوسرے مصنفین ، صاحب بصریہ کے معاصرین میں ہیں ، ابن العدیم اس کا دوست ہے اور اس کی تقریظ « البصریة » پر موجود ہے ، قطب الدین الیونینی (م ٦٢٧) کی «ذیل مرآة الزمان» ٦٨٨ کے واقعات سے شروع ہوکر ٦٦٠ھ پر ختم ہوتی ہے حالانکہ ہمارے مصنف کی وفات ٦٥٩ھ میں ہوئی ہے . یونینی کے والد «الملک الناصر» کے دربار سے متعلق تھے اور اس کتاب میں ان کے عہد کے حالات تفصیل سے درج ہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مصنف «البصریة» کا کہیں استطراداً بھی ذکر نہیں . یہی حال سبط ابن الجوزی کی «ذیل مرآة الزمان» کا ہے . ابن أیاس (م ٩٣٠ھ) نے الملک الناصر کے آخری عہد کے حالات ، منگول کا حلب پر حملہ ، بادشاہ اور اسکے درباریوں کا قتل ، یہ سارے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں ، حد یہ کہ دربار کے جو علماء اور شعراء قتل ہوئے . ان کے نام تک لکھ دیے ہیں لیکن صدر الدین کا وہاں بھی

ذکر نہیں ملتا ۔ سیوطی اپنی کتابوں میں «حماسۃ البصریہ» کے حوالے دیتے ہیں لیکن ان کی کتابیں بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں ۔

مصنف کے متعلق چند باتیں جو معلوم کر سکا ہوں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔ دمشق اور بصرے میں اس کا قیام ثابت ہے ، اس زمانے کے متعدد ملوک و امراء سے اس کے ذاتی تعلقات تھے اور ان میں سے بعضوں کی مصاحبت میں وہ عزت اور آسودگی کی زندگی گزار رہا تھا ، امیر حلب صلاح الدین ابو المظفر یوسف بن الملک العزیز بن الملک الظاہر (٦٢٢ھ - ٦٥٩ھ) کے ساتھ وہ مدتوں رہا ، اس زمانے میں اس نے «الحماسة البصرية» حاجی خلیفہ[1] کے بیان کے مطابق ٦٤٧ھ میں مرتب کیا اور اس کے نام سے معنون کیا[2] ، بعد میں وہ اس میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا ، اب کی مرتبہ اس نے امیرالمؤمنین المستعصم باللہ (٦٠٩ - ٦٥٦ھ) کا نام بھی دیباچے میں درج کردیا[3] . اس کی دوسری تصنیف جس کا اب تک پتا چل سکا ہے وہ «المناقب العباسية و المفاخر المستنصرية»[4] ہے جو عباسیوں کے دور کی ایک

(١) کشف الظنون . (١: ٦٩٣)

(٢) مؤلف دیباچے میں لکھتا ہے : «و بعد فإنه لما كانت المجاميع الشعرية صقال الأذهان ولأنواع المعانى كالترجمان . و كان مولانا الملك الناصر صلاح الدنيا و الدين ابو المظفر يوسف بن الملك العزيز بن الملك الظاهر — لا زال نافذ الأوامر مى كل نجد و غائر — لهجاً باشعار العرب التى هى ديوان الأدب توخيت فى تحرير مجموع محتو على قلائد اشعارهم و غرر أخبارهم . .» (الحماسة البصرية ١ : ٢) .

(٣) «و أدام الله أيام سيدنا مولانا الإمام المفترض الطاعة على جميع الأنام أبى احمد المستعصم بالله أمير المؤمنين و خليفة رب العالمين» (الحماسة البصرية ١ : ٢)

یہ سطریں پہلی روایت میں موجود نہیں . اسی لیے نسخۂ عاشر آفندی جو پہلی روایت پر مبنی ہے ان سطور سے خالی ہے .

(٤) اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ کتب‌خانۂ ملیّ پیرس میں راقم کی نگاہ سے گزرا ہے اس کا نمبر ٤١٤٤ ہے اس پر REI بابت ١٩٣٨ میں ایک مضمون شایع ہوا ہے . اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کی اب تک کوئی اطلاع نہیں ہے .

مختصر تاریخ ہے جسے اس نے الملک الظاہر رکن الدین بیبرس البندقداری الصالحی النجمی (٦٥٨ ـ ٦٧٢ ھ) کے نام معنون کیا ہے۔ جن امراء کا وہ متوسل تھا اور جن علماء نے اسکی کتاب پر تقریظیں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں بہت اونچا درجہ رکھتا تھا۔
زندگی کے اور حالات کا علم نہیں۔ وفات کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حلب میں ابو المظفر یوسف کی رفاقت میں زندگی گزار رہا تھا کہ ہلاکو نے ٦٥٩ ھ میں حلب پر حملہ کیا، الملک الناصر قتل کردیا گیا اور اس کے ہم نشینوں کے ساتھ ہمارا مصنف بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس کا سال وفات ٦٥٩ ھ (بقول حاجی خلیفہ ٦٥٦ھ) ہے۔ سال ولادت معلوم نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ مدتوں وہ امراء اور ملوک کے ساتھ رہا پھر یہ کہ اس کے معاصرین عام طور پر وہی ہیں جن کی وفات ساتویں صدی ہجری کے ساتویں یا آٹھویں عشرے میں ہوئی ہے، قیاس چاہتا ہے کہ مصنف کی ولادت بھی چھٹی صدی ہجری کے اواخر یا ساتویں صدی کے بالکل اوائل میں ہوئی ہوگی۔
«تاریخ بغداد»، مصنفہ ابن الدبیثی (٥٥٨ ـ ٦٣٧ ھ) میں علی بن أبی الفرج نام کے دو اصحاب کا ذکر ملتا ہے۔ اول الذکر تو کسی طرح ہمارا مصنف نہیں ہوسکتا وہ ہمارے مصنف سے قدیم معلوم ہوتا ہے۔ آخر الذکر کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ دونوں کا نام «علی» ہے دونوں کے باپ کا نام «ابوالفرج» دونوں کی کنیت «ابو الحسن» ہے اور دونوں بصرہ کے رہنے والے ہیں، یہی ساری باتیں ہمارے مصنف میں بھی مشترک ہیں، ہاں ہمارے مصنف کے یہاں کسی عرف کا پتا نہیں چلتا اس کی دونوں تصانیف میں بھی اس کے نام کے ساتھ عرف نہیں ہے اور جہاں جہاں اس کا ذکر پایا جاتا ہے وہ بھی عرف کے بغیر، لیکن «تاریخ بغداد» کے دونوں اصحاب، نام کے ساتھ عرف بھی رکھتے ہیں، ایک «ابن الدباب» دوسرے «ابن کمہ»۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے مصنف کا لقب صدرالدین ہے اور ان اصحاب کے ترجموں میں یہ لقب نہیں ملتا۔

ہم ذیل میں «تأریخ بغداد» سے ان دونوں اصحاب کے ترجمے نقل کرتے ہیں[1]:

(الف) «علی بن أبی الفرج بن أبی المعالی أبوالحسن یعرف بابن الدباب، من أهل باب البصرة سمع أبا محمد محمد بن أحمد بن المادح وروی عنه سمع منه أصحابنا».

(ب) «علی بن أبی الفرج بن جعفر البصری الأصل، البغدادی المولد والدار، أبوالحسن یعرف بابن كبة، سمع أباالفتح محمد بن عبدالباقی بن سليمان المعروف بابن البطی و روی عنه سمعنا منه شيئاً يسيراً قرأت علی أبی الحسن علی بن أبی الفرج البصری أخبركم أبو الفتح محمد بن عبد الباقی بن أحمد سلمان قراءةً عليه و أنت تسمع فأقرّ به قال أنا أبو عبدالله مالك بن أحمد بن علی قراءةً عليه قال أنا أبوالحسن أحمد بن محمد بن موسی بن الصلت قال أنا أبو إسحاق إبراهيم بن عبدالصمد الهاشمی قال أنا الحسين بن الحسن المروزی قال أنا عبد الله بن المبارك والفضل بن موسی قال أنا عبدالله بن سعيد بن أبی هند عن أبيه عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله عليه و سلم :نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس الصحة و الفراغ» .

الحماسة البصرية کے مآخذ و مصادر :

مصنف نے «حماسۂ بصریہ» کی تمہید میں صرف ایک کتاب سے استفادے کا صراحةً ذکر کیا ہے اور وہ خالدیّین کی «الأشباه و النظائر من شعراء المتقدمين و الجاهلية و المخضرمين»[2] ہے۔ اصل کتاب میں بھی ایک مقام پر اس کا ذکر موجود[3] ہے۔ اس کتاب کا صراحةً اور کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن قرائن مؤید ہیں کہ «بصریہ» کا حماسۂ ابو تمام کے بعد سے بڑا مأخذ یہی

(۱) راقم پروفیسر F. Krenkow کا ممنون ہے کہ اپنی مشغولیت اور شدید علالت کے باوجود ابن الدبیثی کی «تأریخ بغداد» کے ایک قلمی نسخے سے یہ ترجمے انہوں نے خود نقل کر کے بھیجے۔ افسوس ہے یہ مرض، مرض الموت ثابت ہوا اور انہوں نے کیمبرج ہی میں ۱۹۵۳ میں انتقال کیا۔

(۲) الحماسة البصرية (۱ : ۲) تصحیح : مختار الدین احمد (حیدرآباد ۱۹٦٤)۔

(۳) «وقال ابن أم حزنة . . و رواها الخالدیّان لمالک بن نويرة و ليست له» (البصرية ۱ : ۲٤۹).

خالدیین کا حماسہ ہے۔ راقم کے اندازے کے مطابق ۱۰۰ سے زائد قطعے وہیں سے منقول ہیں، بیسیوں کمیاب قطعے جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملا اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ اشعار سے قطع نظر بعض مقامات پر عنوان کی عبارت تک بھی ہیں، با معمولی اختلاف کے ساتھ «بصریہ» کے مصنف نے «حماسۂ خالدیین» سے نقل کردیے ہیں[1]۔

«حماسۂ بصریہ» کا دوسرا اہم مأخذ «حماسۂ ابو تمام» ہے، ایک جگہ کتاب میں بھی اس کی صراحت ملتی ہے[2]۔ حماسۂ ابو تمام سے کس حد تک ہمارے مصنف نے اخذ کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ صرف باب الحماسة میں کوئی چالیس قطعات «حماسۂ ابو تمام» سے ماخوذ ہیں۔

تیسری کتاب جس کا ذکر صراحةً موجود ہے «دیوان سلم الخاسر» ہے۔[3]

جاحظ، صاحب بصریہ کے محبوب مصنفوں میں ہے اور اس کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن یہ کہیں نہیں پتا چلتا کہ اس کی کیا کتابیں مصنف کے پیش نظر تھیں، اس بات کی تحقیق کے لیے جاحظ کی تقریباً تمام مطبوعہ کتابیں دیکھیں۔ یقین غالب ہے کہ «کتاب الحیوان» سے یقینی طور پر اس نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ابھی سلم الخاسر کے «دیوان» کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعہ دیوان میں تو نہیں لیکن جاحظ نے اسکی طرف منسوب کیا ہے، یہ قطعہ جاحظ کی «کتاب الحیوان» میں سلم الخاسر کے نام سے موجود ہے[4]۔ یہ قطعہ، کسی اور مأخذ کا کیا ذکر، خود جاحظ کی کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گذرا۔ اسی طرح «باب خرافات العرب»[5] میں بعض قطعے

(۱) الحماسة البصرية (۱ : ۵۳) و (۲ : ۳۲۹) ؛ الحماسة الخالديين : ۸۷، و ۱۳۱ (نسخۂ استاذ الميمنى) .

(۲) «ونسبها أبو تمام إلى أبان بن عبدة وليست له» (البصرية ۱ : ۸)

(۳) وقال سلم الخاسر : «تبدت . . . أثر الورس» وقد نسبها الجاحظ إليه وليست فى ديوانه».

(٤) الجاحظ : كتاب الحيوان (۳ : ۹۰) البصرية (۱ : ۱۶۱).

(۵) البصرية (۲ : ۳۹۵ - ۴۰۱).

« کتاب الحیوان » ہی سے ماخوذ ہیں[1]. شبرمۃ بن الطفیل کے ایک قطعے کو جاحظ کی سند پر مصنف نے ابن الطثریہ کی طرف منسوب کیا ہے[2]. یہ قطعہ کتاب الحیوان » میں موجود ہے اور ابن الطثریۃ ہی کے نام پر درج[3] ہے .

عمر بن أبی ربیعہ کی طرف منسوب ایک مشہور قطعہ[4] :

قالت وعیش أخی و حرمة والدی لأنبهنّ الحیّ إن لم تخرج

متعدد مصادر میں اس کی طرف منسوب ہے[5] بعضوں نے جمیل بن معمر العذری کی طرف بھی منسوب کیا ہے[6]. یہ قطعہ ہمارے مصنف نے عبید بن أوس الطائی کی طرف منسوب کیا ہے . اس شاعر کی طرف انتساب صرف «کتاب الحیوان»[7] میں ملتا ہے کسی اور مأخذ میں یہ انتساب دیکھنے میں نہیں آیا . ابو البلاد الطہوی کا قطعۂ نونیہ[8] اور اس کے متعلق خبر کا مأخذ بھی ممکن ہے « کتاب الحیوان » ہی ہو[9] .

أمیة بن ابی الصلت کا قطعہ «صربرا»[10] «کتاب الحیوان» ہی سے ماخوذ ہے[11]، عبارت نثر بھی وہیں سے لی گئی ہے. « کتاب الحیوان» میں اس قطعے

---

(۱) کتاب الحیوان (٤ : ٤١٦) .

(۲) «وقال شبرمة بن الطفیل و نسبها الجاحظ إلی یزید بن الطثریة » (البصریه ۲ : ۳۸٤) .

(۳) الحیوان (٦ : ۱۷۹)

(٤) البصریه (۲ : ۱۱۳)

(٥) الاغانی (۱ : ۱۹۱) ، والسیوطی : شرح شواهد المغنی : ۱۱۰ والمحاسن والأضداد : ۳٤٥ والعینی : شرح شواهد المغنی : (۳ : ۲۷۹) واللسان ماده (حشرج)

(٦) الوفیات (۱ : ۱٦۱)

(۷) الحیوان (٦ : ۱۸۲)

(۸) البصریه (۲ : ۳۹۷)

(۹) الحیوان (٦ : ۲۳٤)

(۱۰) البصریه (۲ : ۲۹٥)

(۱۱) الحیوان (٤ : ٤٦٦)

کے بعد الورل الطائی کا قطعہ ہے ، یہاں بھی اسی ترتیب سے ہے اور وہی روایت ہے اور وہی قائل ہے[1]۔

ثعلب (۲۰۰ - ۲۹۱ ھ) کی تصانیف میں سے بھی کوئی کتاب اس کے پیش نظر ضرور تھی لیکن راقم یہ پتا چلانے سے قاصر رہا کہ وہ کتاب کیا ہے؟ قعنب بن أم صاحب کا قطعہ «و إن ضنوا»[2] جو حماسۂ ابو تمام اور دوسری مشہور کتابوں میں مندرج ہے[3]۔ اس کے متعلق ہمارے مصنف نے اضافہ کیا ہے کہ ثعلب نے اسے طیسلة الفراری کی طرف منسوب کیا ہے[4]۔

ان کتابوں کے علاوہ قراین مؤید ہیں کہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی حماسۂ بصریہ کے ماخذوں میں ہیں:

مجموعة المعانی۔

صابیء بن الحارث[5] البرجمی کے قطعۂ مائیہ کے دو شعر «یجیب» اور «وجیب» حماسۂ بصریہ میں اسی طرح درج ہیں جس طرح «مجموعة المعانی» میں، حالانکہ «حماسۂ بصریہ» اور «مجموعة المعانی» کی قراءت میں اور دوسرے مصادر کی قراءتوں میں کافی اختلافات ہیں۔ بحتری کا ایک قطعہ[6] «شمائل اسی مخلد» کی روایت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح «مجموعة المعانی» میں حالانکہ دیوان کی روایت میں اختلاف ہے۔ جابر بن رألان الطائی کا قطعہ «مأرب» بھی «مجموعة المعانی» سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے دونوں کے عنوانات بھی ایک ہیں[7]۔

(۱) البصریة (۲ . ۳۹۶) ، الحیوان (٤ : ٤٦٨)

(۲) البصریة (۲ : ۷٦)

(۳) ابو تمام: الحماسة (٤ : ۱۲)، ابن الشجری: المختارات: ۹، سیوطی شرح شواهد المغنی: ۲۲٦

(٤) «و نسبها ثعلب إلی طیسلة الفراری» (البصریة ۲ : ۷٦)

(٥) البصریه (۲ : ٥٦)، مجموعة المعانی: ۱٥۳

(٦) البصریة (۱ : ۱۷٥)، مجموعة المعانی: ۱٦۸، دیوان البحتری: ۱۷۲ (مصر ۱۹۱۱ء).

(۷) البصریة (۲ : ۳٥۲) «قال جابر فی صفة ماء» «مجموعه» میں عنوان ہے «ما قیل فی المیاه» اس کے بعد سب سے پہلا قطعہ یہی درج کیا ہے۔

حماسۂ بحتری :

باب الملح و المجون کے تین قطعات رقم : ۳۹ ، ۴۱ ، ۴۵ باب الإنابة والزهد کا قطعہ رقم : ۱۹ یہ سارے قطعات حماسۂ بحتری ہی سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں . ایک قطعہ جو «الحماسة البصریة» نسخۂ راغب میں نہیں[1] بحتری ہی سے ماخوذ ہے ، قطعہ کی روایت بھی وہی ہے جو بحتری کے یہاں ہے. اسی طرح کچھ اور قطعات کے متعلق قیاس ہے کہ وہ حماسۂ بحتری سے ماخوذ ہیں. بعض گم نام شاعروں کے اشعار کا سرچشمہ بھی یہی حماسۂ بحتری ہو تو عجب نہیں

حماسۂ ابن الشجری :

الحماسة البصریة کے ماخذوں میں حماسۂ ابن الشجری بھی معلوم ہوتا ہے . ابن ہرمہ کا قطعہ « الدائل»[2] اور یزید بن حکم الثقفی کا عینیہ « واقع»[3] دونوں ابن الشجری کے حماسے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں .

زهر الآداب للحصری :

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حصری کی « زهر الآداب » بھی مصنف کے مأخذوں میں ہے. « استطراد » کے ذکر میں الحصری نے بکر بن النطاح کے جس قطعۂ بائیہ « بکوکب » کو پیش کیا ہے وہی « بصریہ » میں موجود ہے . ہمارے یہاں عنوان ہے . « وجاءت باستطراد فیه هجاء و مدح[4]».

الإقتضاب فی شرح أدب الكتّاب :

یہ کتاب بھی بصریہ کے ماخذوں میں معلوم ہوتی ہے . ایک قطعہ « العویل » غالباً اسی کتاب سے ماخوذ ہے[5] . روایت بھی لفظ بہ لفظ وہی ہے. سیرت کی کتابوں میں یہ قطعہ عبداللہ بن رواحہ رض کے نام ہے ، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ قطعہ نہ تو حسان بن ثابت رض کے دیوان میں ہے اور

---

(۱) حماسۂ بصریہ نسخۂ عاشر آفندی : ۴۱۳ ، حماسۂ بحتری : ۲۶۸

(۱) البصریه (۱ : ۱۶۱) ، ابن الشجری : ۱۰۵

(۳) البصریه (۲ : ۱۷) ، ابن الشجری ۱۳۹

(٤) البصریه (۱ : ۱۶۳) ، الحصری : زهرالآداب (٤ : ۱۵۲)

(٥) البصریه (۱ : ۲۰۱) و الإقتضاب : ۳۶۹

نہ کسی ماخذ میں ہماری نظر سے گذرا ۔ «الإقتضاب» ہی ایسی کتاب ہے جس میں بلا اختلاف حسان کے نام درج ہونا اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ بصریہ کے مصنف نے وہیں سے اخذ کیا ہے ۔ اسی طرح ایک قطعہ «لنفدمی» ہمیں کسی کتاب میں نہ مل سکا یہ «الإقتضاب» میں موجود ہے[1]، روایت بالکل وہی ہے، وہاں بھی قائل مجھول ہے یہاں بھی قائل کا نام درج نہیں ۔

اسی طرح بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو ھلال العسکری کی «کتاب المعانی» بھی «البصریۃ» کے ماخذوں میں ہے ۔

بصریہ کے اوہام و اسقام :

حماسۂ بصریہ کی ترتیب و تھذیب پر مصنف ایک عرصہ تک کام کرتا رہا ہے، خیال تھا کہ کم از کم آخری روایت، اغلاط و اوہام سے بہت حد تک پاک ہوگی ۔ مصنف نے کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے کہ خالدیین نے اکثر اشعار غیر قائلین کی طرف منسوب کردیے ہیں اور یوں سینکڑوں غلط ہوگئی ہیں، اصل کتاب میں بھی ایک جگہ ان پر اعتراض کیا ہے : «ورواھا الخالدیان لمالک بن نویرۃ ولیست لہ»[2] اور لطف یہ ہے کہ نسخۂ عاشر میں یہی قطعہ مالک بن نویرۃ کی طرف اس نے خود منسوب کیا ہے ۔ خالدیین نے ممکن ہے بعض قطعات غیر قائلین کی طرف منسوب کیے ہوں لیکن کم از کم ہمارے مصنف کو اس پر اعتراض کا حق نہیں بیسیوں مقامات پر خود غیر قائلین کی طرف اشعار منسوب کیے ہیں ۔ اور بھی متعدد قسم کی بے قاعدگیاں اس کتاب میں ملتی ہیں ۔

ایک ہی قطعہ دو شاعروں کی طرف منسوب کیا ہے، ایک شاعر کے قطعے میں دوسرے شاعر کے اشعار داخل کردیے ہیں، باپ کا شعر بیٹے کی طرف منسوب کیا ہے ۔ شعراء کے نام غلط لکھے ہیں انہیں غلط قبیلوں کی طرف منسوب کیا ہے ۔ شعراء کے زمانۂ حیات کے متعلق اس کا تصور واضح نہیں ۔

(۱) البصریہ (۱ : ۷۳) و الإقتضاب : ۳۶۹

(۲) البصریہ (۱ : ۲۴۹) ۔

ہمارا مصنف اسلامی عہد کے شعراء کو مخضرم لکھتا ہے اور مخضرم کو اسلامی عہد کا شاعر تصور کرتا ہے۔ جاہلی شاعر کو وہ اسلامی لکھتا ہے اور اسلامی عہد کے شاعر کو عہدِ جاہلیت کے شعراء میں شمار کرتا ہے۔ اس قسم کے اوہام کی مثالیں کتاب میں جا بجا بکھری ہوئی ملیں گی۔ یہاں استقصا مقصود نہیں صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

«حماسۂ بصریہ» کا قطعہ، «تسبقُ»[1] اور «سماق»[2] مصنف نے أعشیٰ ہمدان کی طرف منسوب کیا ہے یہ قطعے أعشیٰ میموں کے ہیں۔ طرفہ کا قطعہ «ذلیلُ»[3] جو اس کے دیوان اور «حماسۂ ابو تمام» میں موجود ہے مصنف نے نسخۂ راغب میں جو اس کی کتاب کی روایت دوم ہے اپنے خیال میں صحیح کر کے ہیثم بن الأسود النخعی کی طرف منسوب کیا ہے۔ صحیح وہی ہے جو نسخۂ عاشر میں اس نے درج کیا تھا۔ عربی شاعری کا مشہور قطعۂ تائیہ جو زینب بنت یوسف اختِ حجاج کی تشبیب میں ہے اسے عبداللہ بن نمیر کی طرف منسوب کیا ہے[4]۔ صحیح یہ ہے کہ یہ قطعہ اس کے بیٹے محمد بن عبداللہ النمیری کے نتائج فکر میں سے ہے۔ اس طرح ایک قطعہ «لازمُ» عبد الأعلی القرشی کی طرف منسوب کیا ہے[5]۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ قطعہ اس کے بیٹے عبد اللہ بن عبد الأعلی کی ملکیت ہے۔ أعشیٰ میمون کا قطعہ «الناظرِ» مصنف کے خیال میں زہیر بن أبی سُلمیٰ کا ہے[6] یہ قطعہ «دیوان اعشی» کے علاوہ شواہد مغنی کی تمام شرحوں میں یہاں تک کہ «کتاب سیبویہ» میں بھی موجود ہے اور ان سارے مصادر میں اس کی نسبت أعشیٰ کی طرف ہے۔ نسخۂ عاشر میں ابراہیم الصولی کا قطعہ «الناظرُ» اس کے دیوان میں اور مختلف مصادر میں اس کے نام درج ہے، ہمارا مصنف اس کا قائل فتح بن خاقان کو بتاتا ہے[7]۔ ایک قطعہ «مقنعُ» ابو تمام نے عقبۃ بن بجیر اور تبریزی نے مسکین الدارمی کی

(١) البصریۃ ١ : ٣٢
(٢) البصریۃ ١ : ١٧٥
(٣) البصریۃ ١ : ٧٣
(٤) ایضاً ٢ : ٣٠٥
(٥) ایضاً ٢ : ٤٢٧
(٦) ایضاً ١ : ١٦٧
(٧) ایضاً ١ : ٢٦٧

طرف منسوب کیا ہے . ابو تمام کا حماسہ «بصریہ» کے اہم مأخذوں میں ہے۔ پھر بھی وہ ان دونوں نسبتوں سے اعراض کرکے عقبة بن مسکین الدارمی کو اس قطعے کا مصنف بتاتا ہے[١] . یہ قطعہ طفیل الغنوی، کعب بن سعد الغنوی، اور عروة بن الورد کی طرف بھی منسوب ہے لیکن عقبة بن مسکین الدارمی کی طرف نسبت کسی اور مصدر میں راقم کی نظر سے نہیں گذری .

قبیلوں کی طرف غلط نسبتوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً اس نے الحارث بن عباد کو عبسی لکھا ہے[٢] در حقیقت وہ بکری ہے، أعشی میمون کو باهلی لکھا ہے[٣] أعشیٰ باھلہ دوسرا شاعر ہے جس کا نام عامر بن الحارث ہے اور کنیت ابو قحافہ .

ہمارا مصنف شعراء کے نام تک غلط لکھتا ہے . المتوکل اللیثی کا نام عبداللہ بن نہشل بتایا ہے[٤] حالانکہ عبداللہ اس کے باپ کا نام ہے . ابوالخطار کا نام بشر بن صعوان الکلابی لکھا ہے[٥] . اس کا نام حسام بن ضرار الکلبی ہے . أحوص الیربوعی کو زید کا بیٹا بتاتا ہے[٦]. حقیقت یہ ہے زید خود اس کا نام ہے باپ کا نام عمرو ہے . أمیة بن أبی الصلت کے بیٹے کا نام ابوالقاسم لکھا ہے[٧] ، اس کا نام قاسم بن امیة ہے . ابوالعباس الأعمیٰ کا نام المسیب بن فروخ نہیں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے[٨] بلکہ السائب بن فروخ ہے . مروان بن ابی حفصہ کا نام زید نہیں[٩]، یزید ہے . ابوالطمحان القینی کا نام شرقی بن حنظلہ[١٠] نہیں حنظلة بن الشرقی ہے . أعشیٰ بنی ربیعة کا نام عبد اللہ بن خارجہ ہے، عبد اللہ بن المخارق نہیں جیسا کہ مؤلف نے لکھا ہے[١١]. ایک قطعہ «لایموت» کا مصنف عجلان النهدی کو بتایا ہے[١٢] . اس کا صحیح نام عبداللہ بن العجلان النہدی ہے . ابوحکیمہ راشد بن اسحاق کا نام

(١) البصرية ٢ : ٢٤٧ (٢) البصرية ١ : ١٦ (٣) البصرية ١ : ٨٥
(٤) ایضاً ٢ : ١٥ (٥) ایضاً ١ : ٨١ (٦) ایضاً ١ : ١٢٩
(٧) ایضاً ١ : ١٢٤ (٨) ایضاً ١ : ١٣٧ (٩) ایضاً ١ : ١٤٢
(١٠) ایضاً ١ : ١٦١ (١١) ایضاً ٢ : ٩ (١٢) ایضاً ٢ : ١١٥

أبو حکیمه بن راشد لکھا ھے[1]. ایک مقام پر ابو حکیمه کو أبو حلیمه بھی لکھا ھے[2]. العوام بن کعب بن زھیر کا نام ابو العوام بن کعب لکھا ھے[3].

طریف العبسی کے قطعۂ رائیه کے متعلق لکھا ھے که شاعر نے اپنے باپ کے مرثیے میں لکھا ھے[4]. اس قطعے کے چوتھے شعر:

وکنت به أکنی فأصبحت کلما کنیت به فاضت دموعی علی نحری

سے یه بات قطعی ھو جاتی ھے که یه اشعار باپ کے مرثیے کے نہیں بلکه بیٹے کے مرثیے کے ھیں.

شعراء کے عہد کے متعلق ھمارے مصنف کا تصور کس قدر غیر واضح ھے اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ھوگا:

وہ قیس بن الخطیم کو جو مخضرم ھے کبھی جاھلی سمجھتا ھے[5] اور کبھی اموی[6] لکھتا ھے، اسی طرح اس نے کمیت بن معروف کو اموی لکھا ھے[7]. کون نہیں جانتا که وہ مخضرم ھے. عہد سرور کائنات صلی اللہ علیه وسلم میں وہ اسلام لائے لیکن ملاقات نه ھوسکی. مضرس بن ربعی کو جاھلی بتایا ھے[8]، کتب تواریخ میں فرزدق سے اس کی ملاقات کا حال لکھا ھے یه اگر صحیح ھے تو وہ جاھلی کیوں کر ھوسکتا ھے. القتال الکلابی کو اس نے جاھلی لکھا ھے[9] مرزوقی نے اسے اسلامی بتایا ھے. وہ اموی عہد کا شاعر ھے. ھیثم بن الأسود کو جاھلی لکھا ھے[10]، یه عہد امیه کا شاعر ھے ابن حجر کی «الإصابة» اور «تہذیب التہذیب» دیکھی جائے. ابو کبیر الھذلی کو جاھلی لکھا ھے[11]، یه حقیقت میں مخضرم ھیں اور بعضوں نے انہیں صحابی لکھا ھے. ربیعة بن مقروم الضبی کو ایک نسخے میں جاھلی لکھا ھے[12] یه مخضرم

(۱) البصریة ۲ : ۱۸۲ (۲) البصریة ۲ : ۱۷۹ (۳) البصریة ۲ : ۱۹۱
(٤) ایضاً ۱: ۲٤۰ (٥) ایضاً ۱ : ۱۲ (٦) ایضاً ۲ : ۸٥
(۷) ایضاً ۲ : ۸۹، ۱۰٥ (۸) ایضاً ۱ : ۳۰
(۹) ایضاً ۱ : ۳٤ (۱۰) ایضاً ۱ : ٤۳ (۱۱) ایضاً ۱ : ٥۸
(۱۲) ایضاً ۲ : ٤٦

هے «الإصابہ» اور «معجم الشعراء» للمرزبانی ملاحظہ ہو. سُلمیٰ بن ربیعۃ کو نسخۂ نور عثمانیہ میں مخضرم لکھا ہے[1]. «سمط اللآلی» اور دوسرے مصادر میں تصریح ہے کہ وہ جاہلی شاعر ہے. اسی طرح شماخ کو اسلامی لکھا ہے[2] یہ مخضرم ہے لطف یہ ہے کہ ایک مقام پر مصنف اسے مخضرم لکھ آیا ہے[3]

«الحماسۃ البصریۃ» کے قلمی نسخے:

اس وقت مشرق و مغرب کے کتاب خانوں میں «حماسۂ بصریہ» کے متعدد مکمل اور ناقص نسخے پائے جاتے ہیں لیکن اُمہات نسخ کی تعداد دو تین سے زاید نہیں، بقیہ نسخے انہی نسخوں کی نقلیں ہیں یا بہت بعد کے لکھے ہوئے ہیں اور اغلاط سے بھرے ہوئے ذیل میں معلوم شدہ نسخوں کی مختصر کیفیت لکھی جاتی ہے:

۱۔ نسخۂ کتاب خانۂ عاشر آفندی استانبول رقم: ۷۸٦

اوراق ۲٤۳ سطور ۱۵ یہ «بصریہ» کی وہ مختصر روایت ہے جو مصنف نے ابتدا میں ٦٤۷ ھ میں مرتب کی تھی اور سلطان ابوالمظفر یوسف بن الملک العزیز[4] کی خدمت میں پیش کی تھی. اس نسخے کے آخر میں الملک الناصر داؤد بن عیسیٰ بن أبی بکر بن ایوب[5]، ابن العدیم[6]، کمال الدین بن طلحۃ[7]، وزیر مؤید الدین ابراهیم ابن القفطی[8]، شہاب الدین یحییٰ بن

(۱) البصریۃ ۱ : ٥٦ (۲) البصریۃ ۱ : ۱۲۱

(۳) ایضاً ۱ : ۱۲۹ (٤) (٦۲۷ ـ ٦٥۹ھ) رک (=رجوع کنید)

(٥) (٦۰۳ ـ ٦٥٦ھ) رک وفیات الأعیان (۱ : ۱٥٦)، فوات الوفیات (۱ : ۳۹۷)

(٦) (٥۸٦ ـ ٦٦۰ھ) رک فوات الوفیات (۲ : ۱۰۱)، شذرات الذهب (٥ : ۳۰۳)

(۷) (٥۸۲ ـ ٦٥۲ھ) رک السبکی: طبقات الشافعیۃ (٥ : ۲٦)، شذرات الذهب (٥ : ۲٥۹)

(۸) (٥٩٤ ـ ٦٥۸ھ) رک الأدفوی: الطالع السعید: ۳۳

القیسرانی[1] ، نظام الدین محمد بن للولوی للنشق[2] ، فتح الدین اسحاق بن یعیش[3] ، مجد الدین ابو عبداللہ محمد بن أحمد الإربلی معروف بابن الظهیر[4] ، ابن مالک

---

(۱) ابن القیسرانی اور ابن الظهیر الإربلی کے متعلق Prof. Sir Hamilton Gibb ایک خط میں اطلاع دیتے ہیں :

"The only two persons whom I can identify in your lists are : Shihab ad-Din Yahya ibn al Qaisarani, for whom see *al-Durar al-Kamina* of Ibn Hajar, Vol. ix, No 1142, and Majid ad-Din (Abu 'Abdullah Muhammad b Ahmad) al Arbili, Called Ibn Zuhair (d. 677/1278), who is mentioned in *Les Biographies du Manhal Safi* (cf Ibn Taghribardi index prepared G G. wiet (Cairo 1932) no. 2024"

ابن الظهیر الإربلی کا ترجمہ تو بعد کو مجھے اور مصادر میں بھی مل گیا لیکن استاذ مکرم پروفیسر گب نے جس ابن القیسرانی کے متعلق ابن حجر کی « الدرر الکامنہ » کا حوالہ دیا ہے . وہ ہمارے مصنف کے تقریظ نگار ابن القیسرانی سے مختلف ہیں اس لیے کہ ان کا ابن حجر کی کتاب میں مندرج ہونا ہی ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ آٹھویں صدی ہجری کے عالم ہیں . ان کی ولادت ابن حجر کے قول کے مطابق سنہ ۷۰۰ھ میں ہوئی ہے جبکہ ہمارا مصنف صدرالدین ۶۵۹ھ میں فوت ہوچکا ہے . شهاب الدین یحییٰ بن القیسرانی معاصر صدر الدین ساتویں صدی ہجری کا عالم ہے جسکی وفات چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے عشرۂ پنجم یا ششم میں ہونی چاہیے . جو تاریخی اور ادبی مصادر راقم کی نظر سے گزرے ہیں وہ ان کے متعلق خاموش ہیں . یونینی کی «ذیل مرآۃ الزمان» میں یوسف بن محمد بن غازی کے ذکر میں استطراداً ان کا ذکر آگیا ہے اور سنہ ۶۰۳ھ میں فتح شیزر کے موقع پر ان کے شعر پڑھنے کا ذکر ہے وہاں ان کا نام شهاب الدین یحییٰ بن خالد بن القیسرانی درج ہے (رک الحماسة البصریة ۲ : خاتمہ : ۱۰ فٹ نوٹ (۱)

(۲) (۵۹۵ ـ ۶۵۶ھ) رک الصفدی : الوافی بالوفیات (۱ : ۲۸۳) طبع ۱۹۶۲م

(۳) (۶۰۱ ـ ۶۵۹ھ) رک الیونینی : ذیل مرآۃ الزمان (۲ : ۱۲۶)

(٤) (۶۰۲ ـ ۶۷۷ھ) رک الکتبی : الفوات (۲ : ۱۷۵) ، الصفدی : الوافی ۲ : ۱۳۳ ، ابن العماد : شذرات (۵ : ۳۵۹)

النحوی[1] ، ابن عمرون[2] ، فخر الدین حسین النحوی ، اور عون الدین سلیمان بن عبدالمجید بن العجمی وغیرهم کی تقریظوں کی نقلیں هیں۔ سال کتابت درج نہیں ہے لیکن نسخہ قدیم اور اہم ہے ۔ اس کا ذکر *MFO* جلد ٥ ص ٥٣٨ کے ایک مضمون میں ہوا ہے ۔

٢ ۔ نسخۂ کتب خانۂ عبداللہ باشا الفکری[3] :

صفحات ٢٨١ سطور ٢٦ مکتوبہ ١٢٨٦ ھ خط مغربی مکتوبہ یحییٰ بن محمد بن لوئیس القاصی الزواوی الجزائری ، خاتمۂ کتاب میں کاتب نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ ایک قدیم مخطوطے سے منقول ہے جس کے آخر میں کچھ علماء کی تقریظات درج ہیں ۔ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ پیش نظر نسخہ ، نسخۂ عاشرأفندی رقم : ٧٨٧ کی نقل ہے ۔ اس کی کتابت سلطان عبدالعزیز خاں کے عہد میں استانبول میں کی گئی ہے ۔ یہ نسخہ عبداللہ باشا فکری کی ملکیت میں رہ چکا ہے اب استاد گرامی پروفیسر عبدالعزیز المیمنی کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ سرورق پر ان کے قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: «هذه النسخة لعبد الله باشا الفکری واشتریتها من ابنه ۔ المیمنی» ۔

٣ ۔ نسخۂ کتب خانۂ نور عثمانیہ ، استانبول رقم : ٣٨٠٤

مکتوبہ ٦٥١ ھ اوراق ٢١٣ سطور ١٣ بعض صفحوں میں ١٥ سطریں خط نسخی ، اکثر الفاظ پر حرکات ضبط کردیے گئے ہیں ، حواشی پر کہیں کہیں تصحیحات و تعلیقات بھی درج ہیں ۔ نسخہ مصنف کی زندگی میں نقل کیا گیا ہے اور اب تک کے معلوم شدہ نسخوں میں سب سے قدیم ہے ۔ سرورق پر ایک وقف نامے کی عبارت بقلم ابراہیم حنیف مفتش اوقاف حرمین شرفین درج ہے جو سلطان ترکی ، عثمان خان بن سلطان

---

(١) (٦٠٠ ـ ٦٧٢ھ) رک الکتبی : الفوات (٢ : ٢٢٧) ، السبکی : طبقات الشافعیة (٥ : ٢٨) ؛ الصفدی : الوافی (٣ : ٣٥٩)

(٢) (٥٩٦-٦٤٩ھ) رک السیوطی: بغیة الوعاة : ٩٩ ، الصفدی : الوافی (٤ : ٩٧)

(٣) Brockelmann کی کتاب *GAL* میں اس نسخے کے ذکر سے خالی ہے

مصطفی' خان کے کتب خانے کی اکثر کتابوں پر دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک مہر بھی موجود ہے جس میں «بندۂ لطیف ابراہیم حنیف» منقوش ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں ترجمہ کی عبارت حسب ذیل ہے :

«آخر الکتاب والحمد لله رب العالمین وصلی الله علی سیدنا محمد النبی وآله الطاهرین وسلم تسلیماً کثیرا. وقع الفراغ منه یوم الأحد، العاشر من ربیع الآخر سنة احدی و خمسین وست مائة».

٤ - نسخۂ کتب خانه راغب پاشا، استانبول. رقم: ١٠٩١

اوراق ٥١٠ سطور ١٥ یه نسخه نہایت خوش خط اور صحیح ہے اور ہر لحاظ سے جلیل القدر ہے۔ «مصریه» کے ان دو معلوم شده نسخوں میں یه نسخه ایک ہے، جو مصنف کی زندگی میں نقل کیا گیا ہے۔ جرمن رسالے *ZDMG* جلد ٦٤ ص ٢١١ میں[1] اس پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔

٥ - نسخۂ کتب خانۂ سلمانیه، استانبول. رقم: ٧٨٧ [1]

اوراق ٢٥٢. سال کتابت درج نہیں، نسخه ساتویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتابت خوبصورت نسخ میں ہے، کاتب کا نام سلیمان بن العجمی ہے۔ یه نسخه پہلے مکتبۂ رئیس الکتاب میں تھا، اب جامع سلیمانیه کے کتب خانے میں کئی کتب خانے لاکر جمع کردیے گئے ہیں چنانچه رئیس الکتاب کا کتب خانه بھی وہیں آگیا ہے اور یه نسخه وہیں محفوظ ہے۔

٦ - نسخۂ کتب خانه عاطف آفندی استانبول رقم: ٢٠٥٣ سال کتابت ٩٨٣ ھ اوراق ٣٠٠ سطور ٢٥ تفصیل کے لیے دیکھا جائے *MFO* جلد ٥ ص ٤٨٩.

٧ - نسخۂ کتب خانۂ بلدیه اسکندریه رقم: ١٢٢١[2] اوراق ٨٤ سطور

---

(١) Brockelmann نے اس نسخے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(٢) Brokelmann کی تاریخ ادبیات میں اس نسخه کا کوئی ذکر نہیں، اس کی تفصیلات اور ابتدائی کچھ صفحوں کے عکس جناب مالک رام صاحب ایم - اے نے جو اس وقت مصر میں حکومت ہند کی وزارت خارجه سے متعلق تھے اور اسکندریه میں مقیم تھے راقم کے پاس بھیجے تھے میں اس عنایت کے لیے ان کا ممنون ہوں۔

۲۱ ناقص الآخر کتابت بارھویں صدی ھجری کی معلوم ھوتی ھے لیکن کتابت احتیاط سے کی گئی ھے اور غالباً کوئی قدیم اور صحیح نسخه اس کا منقول عنه رھا ھے. خط بہت صاف روشن ھے، شعرا کے نام سرخ روشنائی سے لکھے گئے ھیں اور متن سیاه ھے، اسی قلم سے جا بجا حاشیه پر تشریحات اور معانی لکھے گئے ھیں بعض صفحات پر کسی اور کے قلم کے حواشی بھی ملتے ھیں اور یه بہت بعد کے لکھے ھوئے ھیں بالعموم ان کی نوعیت معانی یا تشریح کی نہیں بلکه مؤلف نے جو اشعار متن میں دیے ھیں اگر ان کے درمیان سے کوئی شعر چھوٹ گیا ھے تو حاشیه نگار لکھتا ھے «بیت ساقط» یا «تروی أبیات ثلاث فی أولها» اور پھر وه حاشیه نگار شعر نقل کردیتا ھے ایسا معلوم ھوتا ھے که کسی خوش ذوق کے پاس یه نسخه رھا ھے اور یه اندراجات و اضافات سب اسی کے قلم کے ھیں.

۸ ـ نسخۂ کتب خانۂ اسکوریال، اسپین رقم. ۲۸۰٤ یه دو جلدوں میں ھے، دیوان ابن أبی ربیعة (لسک ۱۹۰۲) کے مرتب اس کا حواله دیتا ھے فہرست کتب خانۂ اسکوریال ص ۳۱۳ کے علاوه Brockelmann کی *GAL* میں بھی اس کا ذکر موجود ھے.

۹ـ نسخۂ کتب خانه میلان، اطالیه[1]:

مؤلف گائر نے «دیوان الأعشی» کے حواشی اور اختلاف روایت کے لیے اس نسخے کو استعمال کیا ھے.

۱۰ ـ نسخۂ کتب خانۂ حسین چلپی بروصه، ترکی[2]:

اس نسخه کا ذکر *ZDMG* جلد ٦٨ کے ایک مضمون میں ملتا ھے.

۱۱ ـ نسخۂ دارالکتب المصریه قاھره رقم: ادب: ۵۲۰[3]:

---

(۱) Brockelmann کو اس نسخے کے وجود کا علم نہیں.

(۲) Brockelmann کی کتاب میں اس نسخے کے متعلق کوئی اطلاع موجود نہیں.

(۳) دارالکتب میں نسخۂ راغب استانبول کی عکسی نقل بھی محفوظ ھے. مصور: ٦۳۰۰

سال کتابت ۱۲۸۷ ھ، یہ نسخہ مخطوطۂ راغب پاشا استانبول مکتوبہ ٦٥٤ ھ سے عبدالرحمن بن عبداللہ البغدادی نے اوائل شہر رجب ۱۲۸۷ ھ میں نقل کیا ہے۔

۱۲ ۔ نسخۂ دار الکتب المصریہ (تیموریہ) رقم : الشعر : ۸٦۲

تقطیع خورد صفحات ٦٨١، یہ احمد تیمور پاشا کے کتب خانے کا نسخہ ہے جو اب دارالکتب للمصریة میں محفوظ ہوگیا ہے۔ نسخہ معمولی ہے تعجب نہیں یہ بھی نسخۂ راغب کی نقل ہو، تفصیل *RAAD* جلد ۳ ص ۳٤۲ میں ملاحظہ ہو۔

۱۳ ۔ نسخۂ لوئیس شیخو بیروت[1] :

یہ نسخہ بہت معمولی کاغذ پر دارالکتب المصریہ کے نسخے سے پچاس ساٹھ سال ہوئے نقل کرایا گیا ہے۔ ادارے کی اکثر مطبوعات میں اس نسخے کے حوالے ملتے ہیں۔

١٤ ۔ نسخۂ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد[2] :

تعداد اوراق ۲۳۲ پیش نظر نسخہ «الحماسة المصریہ» کا اختصار اور انتخاب ہے، جس کا نام سرورق پر «منتقیٰ من الحماسة المصریہ» لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد مصنف کا نام اور اس کے نیچے یہ عبارت تحریر ہے: ٦٤٧ تالیف الأصل، «الأصل مذکور فی الکشف والمنتقی لیس بمذکور فیه» کشف الظنون کا کیا ذکر، دوسرے سارے مصادر بھی جو میری نظر سے گذرے ہیں اس انتخاب کے متعلق خاموش ہیں۔ کتابت دو کاتبوں نے مل کر کی ہے ص ۳ سے ص ٢٤ تک اور ۲۳۱ سے ۲۳۲ تک ایک کاتب کے قلم سے اور ص ۲٥ تا ۲۳۰ کی کتابت دوسرے کاتب نے کی ہے اور یہی اصل کاتب معلوم ہوتا ہے، اس انتخاب میں ١٦ ابواب کے بجائے صرف پانچ ابواب ہیں۔ الحماسة، المراثی، الأدب، النسیب، المدیح، نہ کاتب کا نام معلوم ہے اور نہ یہ پتا چل سکا کہ انتخاب کرنے والا کون ہے۔

سرورق پر مالک کتاب کی یہ عبارت ہے:

«من مودعات الدهر لدی الفقیر إلی رحمة الله الصمد عبدالرحمن

---

(۱) Brockelmann نے اس نسخے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۲) Brockelmann نے اس نسخے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

بن عبدالله بن المصطفیٰ بن محمد سنة تسع و عشرين و مائة و ألف ١١٢٩ هـ».

• • •

کتب خانۂ گوتها (مشرقی جرمنی) میں ١٧ صفحات پر مشتمل ایک مخطوطہ محفوظ ہے جس میں ان تمام تقریظات کو جمع کردیا ہے جو نسخۂ عاشر کے آخر میں موجود ہیں ان کا نام «تقریظات حماسة البصرية» رکھدیا ہے. پہلی تقریظ السلطان الملک الناصر صلاح الدين أبو المظفر يوسف بن الملک الظاهر کی ہے اور آخری عون الدين سليمان بن المجيد العجمي کی.

ابتدا : بسم الله الرحمن الرحيم صورة خط السلطان الملک الناصر الخ -

کاتب کا نام عبدالرحمن بن يحيیٰ بن محمد الملاّح ہے. تاریخ کتابت ٢٠ ربیع الثانی ١٠١٦ ہے رقم : ٢١٩٥ .

[١٢/٤/١٩٦٤م]

• • •

فارسی میں علم بدیع کی تاریخ و تدوین

اشفاق علی خاں*

رشید الدین وطواط :

چھٹی صدی ہجری میں علم بدیع کا سب سے مشہور مصنف رشید الدین وطواط ہے جو فارسی کا بہت بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ علم بدیع پر اس کی تصنیف کا نام «حدایق السحر فی دقایق الشعر» ہے۔ مصنف کی طرح اس کی یہ تصنیف بھی بہت مستند اور مشہور ہے۔ رشید عربی و فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا تھا اور دونوں زبانوں میں نظم و نثر اس سے یادگار ہے۔ عربی ادب و لغت میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی وہ زمخشری صاحب کشاف (٤٦٧ ـ ٥٣٨) کا معصر تھا اور ان سے اس کی خط کتابت رہتی تھی۔ ان سے کبھی کبھی اس کے علمی مباحثے بھی ہوئے ہیں جن میں بعض مسائل پر زمخشری نے ان کی بات تسلیم کرلی تھی۔ رشید کے علم و فضل کے متعلق یاقوت «معجم الأدباء» میں لکھتا ہے کہ رشید زمانہ کے عجائبات میں سے تھا۔ وہ نظم و نثر میں اپنے زمانہ کے افاضل میں شمار ہوتا تھا اور دقایق کلام عرب اور اسرار نحو و ادب کے پہچاننے میں کسی کو اس پر برتری حاصل نہیں تھی اور اسی لیے اس کے فضائل کی شہرت ملکوں میں پھیل گئی تھی اور وہ شہرۂ آفاق ہوگیا تھا۔

«ترجمان البلاغة» کے دستیاب ہونے سے پہلے «حدایق السحر» ہی علم بدیع کی سب سے پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی جو دستبرد زمانۂ سے بچ گئی تھی۔ یہ کتاب ہندستان اور ایران میں کئی بار چھپی مگر اب عباس اقبال آشتیانی نے کتبخانۂ ملی پریس کے ایک قلمی نسخے مکتوبہ ٦٦٨ھ کی مدد سے مرتب کرکے تہران میں طبع کرادیا ہے۔

(*) اشفاق علی خاں (ایڈوکیٹ) شاہ جہان پور۔

اصل «حدایق السحر» کل ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں دو صفحوں کا دیباچہ اور آخر میں تین صفحوں کی اصطلاحات ہیں اس کا موضوع خالصةً علم بدیع ہے۔ اس میں درج ذیل صنعتیں ہیں جن میں کچھ لفظی ہیں اور کچھ معنوی :

١ ـ الترصیع
٢ ـ الترصیع مع التجنیس
٣ ـ التجنیسات (تام، ناقص، زاید، مرکب، مکرر، مطرّف خط)
٤ ـ الاشتقاق
٥ ـ الأسجاع (متوازی، متوازن، مطرّف)
٦ ـ المقلوبات (بعض کل، مجنح، مستوی)
٧ ـ ردالعجز علی الصدر
٨ ـ المتضاد
٩ ـ الإعنات
١٠ ـ تضمین المزدوج
١١ ـ الإستعارة
١٢ ـ حسن المطلع
١٣ ـ حسن التخلص
١٤ ـ حسن المقطع
١٥ ـ حسن الطلب
١٦ ـ مراعاة النظیر
١٧ ـ المدح الموجّه
١٨ ـ المحتمل للضدّین
١٩ ـ تاکید المدح بما یشبه الدم
٢٠ ـ الالتفات
٢١ ـ الایهام
٢٢ ـ التشبیهات (مطلق، مشروط، کنایت اضمار، تفصیل)
٢٣ ـ سیاقة الاعداد
٢٤ ـ تنسیق الصفات
٢٥ ـ اعتراض الکلام قبل التمام یا حشو (حشو قبیح، حشو متوسط، حشو ملیح)
٢٦ ـ المتلوّن
٢٧ ـ ارسال المثل
٢٨ ـ ارسال المثلین
٢٩ ـ ذوالقافیتین
٣٠ ـ تجاهل العارف
٣١ ـ السؤال والجواب
٣٢ ـ الموشح
٣٣ ـ المربع
٣٤ ـ المسمط
٣٥ ـ الملمع
٣٦ ـ المقطع
٣٧ ـ الموصل
٣٨ ـ الحذف
٣٩ ـ الرقطاء
٤٠ ـ الخیفاء
٤١ ـ المصحف
٤٢ ـ الترجمة
٤٣ ـ المعمیٰ
٤٤ ـ اللغز
٤٥ ـ التضمین
٤٦ ـ الاغراق فی الصفة
٤٧ ـ الجمع والتفریق و التقسیم (جمع تنہا، تفریق تنہا، تقسیم تنہا، جمع بالتفریق، جمع بالقسیم، جمع با تفریق و تقسیم)
٤٨ ـ تفسیر الجلی و الخفی
٤٩ ـ المتزلزل

۵۰ - المردّف	۵۲ - الکلام الجامع	۵٤ - التعجب
٥ - الاستدراک[1]	۵۳ - الابداع	۵۵ - حسن التعلیل

کتاب کے آخر میں علماے بدیع کی کچھ اصطلاحات دی ہیں ان میں چار صنعتیں اور ملتی ہیں اگرچہ ان کے صنعت ہونے کی تصریح نہیں کی ہے لیکن رشید وطواط کے اصول کے مطابق یہ بھی صنعتوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں: عکس، تدویر[2]، مکرر، اور سہل ممتنع۔

کتاب کے مطالب کی تفصیل یہ ہے: پہلے ہر صنعت کا لقب لکھا ہے پھر اس کی تعریف کی ہے بعض صنعتوں کے القاب کے لغوی معنی بھی بتائے ہیں۔ بعض صنعتوں کے کئی کئی لقب لکھے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایسا لقب بھی ہے جو خاص فارسی والوں کا لکھا ہوا ہے تو اس خصوصیت کی تصریح کردی ہے؛ بعض صنعتوں کے طریق استعمال میں عربی اور فارسی والوں کا اختلاف بھی بیان کردیا ہے۔

ہر صنعت کے لقب اور تعریف کے بعد ایسی مثالیں نقل کی گئی ہیں جن میں وہ صنعت استعمال کی گئی ہو۔ ہر صنعت میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ مثالیں عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے دی جائیں۔ یہ مثالیں نثر اور نظم دونوں پر مشتمل ہیں لیکن نثر کی مثالوں کے لیے یہ التزام نہیں کیا ہے کہ وہ ہر صنعت کے ذیل میں لائی جائیں۔ بعض صنعتوں کے لیے نثر کی مثالیں نقل کی گئی ہیں بعض کے لیے نہیں۔ لیکن ان مثالوں میں عربی اور فارسی کے اشعار التزاماً ہر صنعت کے ذیل میں پیش کیے گیے ہیں۔

عربی نثر کی مثالیں فصحاء و بلغاء سے نقل کی گئی ہیں کہیں ان کے نام لیکر اور کہیں ان کے نام کے بغیر۔ بعض صنعتوں کے ذیل میں عربی

---

(۱) استدراک کوئی صنعت نہیں ہے وطواط بھی اسکے صنعت ہونے کے خلاف ہے۔

(۲) تدویر کے متعلق وطواط خود لکھتا ہے، «این بازی کودکان بود»

نثر کی مثالوں میں قرآن کریم، احادیث نبوی اور صحابہ و تابعین کے اقوال کے اقتباسات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

فارسی نثر کی مثالوں کے ساتھ ان کے مصنفین کے نام کہیں نہیں لیے گیے ہیں۔ جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض وطواط کی خود ساختہ مثالیں ہیں۔ فارسی نثر کی بعض مثالوں کے لیے لکھا گیا ہے کہ «عامه گوید»[1]، «در سخن عامه است»[2]. «حاکیان و وصافان عجم گویند»[3] «حاکیان گوید» ایک فارسی مثال کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک روستائی کا قول ہے بوعلی سینا کے جواب میں۔ اس قول اور اس کے قایل کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے بوعلی سینا کے مرتبے کے لایق بات کہی۔ فارسی نثر کی مثالیں نہایت چھوٹے چھوٹے جملوں یا فقروں پر مشتمل ہیں اور تعداد میں عربی نثر کی مثالوں اور خود فارسی اشعار کے مقابلے میں بہت کم ہیں مثالیہ اشعار میں سے بعض کے ساتھ ان کے شاعروں کے نام بھی لیے گیے ہیں۔ بعض اشعار شاعروں کے نام کے بغیر لائے گئے ہیں۔ جن شعراء کے نام لیے گئے ہیں وہ دو ایک کے سوا سب عربی یا فارسی کے مشاہیر میں سے ہیں ان میں چند شاعر ایسے بھی ہیں جو ذولسانیین ہیں۔ وطواط نے مثال میں اپنے عربی و فارسی شعر بھی لکھے ہیں۔

عام طور پر ہر صنعت کے ذیل میں دو تین فارسی کے شاعروں اور دو تین عربی کے شاعروں کے شعر مثال میں نقل کیے ہیں۔ ہر شاعر کے بالعموم ایک یا دو شعر درج کیے ہیں۔ صرف چند مقامات پر اس سے زیادہ شعر نقل کردیے ہیں۔ وطواط نے امثلہ و شواهد میں پورے پورے قصیدے نقل کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ تین چار مثالیں ایک ایک مصرع کی بھی ہیں۔ صنعت جمع بالتفریق اور حاجب (قبل قافیہ) کے بیان میں عربی کی کوئی مثال نہیں لائی گئی ہے۔ اشعار سے شواهد لانے میں

(۱) حدایق السحر: ۷۳ (۲) حدایق السحر: ٦٦ (۳) حدایق السحر: ٥[illegible]

بالعموم اس ترتیب کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر صنعت کے ذیل میں پہلے عربی کے اشعار نقل کیے گئے ہیں. ان کے بعد فارسی کے اشعار نقل کیے گئے ہیں. اس طرح یہ کتاب عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے علم بدیع پر محتوی ہے البتہ کتاب کی اصل زبان فارسی ہے. وطواط نے دیباچہ میں بھی اس کی تصریح کردی ہے کہ اس نے یہ کتاب عربی اور فارسی دونوں کے محاسن نظم و نثر پر لکھی ہے.

«حدایق السحر» کے دیباچہ میں رشید لکھتا ہے کہ خوارزم شاہ اتسز نے ایک دن بلاکر «ترجمان البلاغة» دکھائی تو اس نے اسے بہت غلط پایا اس لیے اس نے «حدایق السحر» لکھنی ضروری سمجھی اس کے الفاظ یہ ہیں: «ابیات شواهد آن کتاب را بس ناخوش دیدم همه از راه تکلف نظم کرده وبطریق تعسف فراهم آورده وبا این همه از انواع زلل و اصناف خلل خالی نبود واجب شد برمن بنده که پروردهٔ آن درگاهم در معرفت محاسن نظم و نثر دو زبان تازی و پارسی این کتاب ساختن واین مجموع پرداختن».

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید نے «حدایق السحر» «ترجمان البلاغة» کے مقابلے پر لکھی اور ثانی الذکر کتاب دیکھ کر اسے «حدایق السحر» کی تالیف کا خیال آیا. اس موقع پر وہ اتسز کے لیے «نورّ الله مضجعه» کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس کے زمانے کا ذکر ماضی کے صیغے سے کرتا ہے. اس طرح کہ «در ایام دولت او عقود فضل منتظم بود» اس کے بعد بادشاہ اسلام «خلد الله ملکه و سلطنته» اور بادشاہ اسلام «ثبت الله دولته» کے الفاظ لکھے ہیں. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ «ترجمان البلاغة» جسے دیکھ کر رشید نے «حدایق السحر» لکھنے کا ارادہ کیا اتسز نے ہی رشید کو دکھائی تھی لیکن اس کی تالیف اتسز کے زمانے میں نہ ہوسکی بلکہ اس کی وفات کے بعد ہوئی. لہذا اس کا زمانۂ تالیف اتسز کے بیٹے ایل ارسلان(۵۵۱ ـ ۵۶۸ھ) کا دور حکومت سمجھنا چاہیے یا ایل ارسلان کے بیٹے سلطان تکش کا

زمانہ سمجھنا چاہیے یعنی سلطان تکش کے سال جلوس (۵٦۸ ھ) اور رشید کی وفات (۵۷۳ ھ ـ ۵۷۸ ھ) کی درمیانی مدت۔

رشید نے «حدایق السحر» کے مآخذ، مصادر نہیں بتائے ہیں لیکن ان کی کتاب کا سور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تالیف کے وقت «ترجمان البلاغۃ» کے علاوہ اس فن کی متعدد کتابیں رشید کے پیش نظر تھیں اور ان میں عربی کے ساتھ کچھ فارسی کی کتابیں تھیں جو امتداد زمانہ سے ضائع ہوگئیں اور ہم تک نہیں پہنچیں۔

«حدایق السحر» کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں جواقوال رشید وطواط نے علماء، شعرائے پارسی، حلیل، بعضی ار اہل این علم (بدیع)، ارباب صناعت، عجم، اہل صناعت، ارباب بیاں اور قدماء سے نقل کیے ہیں، ایک قول «مردماں» سے بھی نقل کیا ہے باقی اقوال کے لیے صرف «خوانند» لکھا ہے مثلاً «ایں صنعت را تحیل نیر حوانند»، اس «حوانند» کا فاعل ظاہر ہے کہ عوام نہیں ہوسکتے بلکہ «علمائے بدیع» ہیں اس طرح ان اقوال کے ماخذ علمائے بلاغت و بدیع ہیں جن میں عربی اور فارسی دونوں کے اہل علم و نثر شامل ہیں۔ عربی کی مثال میں متنبی کے تین شعر اور فارسی کی مثال میں ایک ایک شعر رودکی اور منطقی کا اور دو دو شعر عنصری اور معزی کے نقل کیے ہیں اب یہ غور طلب ہے کہ یہ اقوال رشید نے ادبی مجلسوں اور عامی تذکروں میں علمائے فن کی زبان سے سنے یا کتابوں میں پڑھے۔ ان اقتباسات کے مطالعہ سے مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ممکن ہے ان اقوال میں چند زبانی سنے ہوئے بھی شامل ہوں، لیکن ان میں کے زیادہ اقوال رشید نے کتابوں میں پڑھے ہیں اور ان سے اپنی کتاب میں نقل کیے۔ رشید جیسے عالم سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسی اہم تالیف میں جو موضوع کے لحاظ سے بھی اہم ہے، اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ایک کتاب کے مقابلہ میں لکھی جارہی ہے اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ایک بادشاہ کے لیے لکھی جارہی ہے، محض سنی سنائی باتیں لکھے گا۔ دو چار باتیں جو بعض صنعتوں کے متعلق اس وقت اہل علم میں بہت زیادہ

مشہور ہوگئی ہوں اور کتابوں میں نہ آ پائی ہوں صرف خواص کی زبان پر ہوں اس کتاب میں ان کے نقل ہونے کا مضایقہ نہیں۔

«حدایق السحر» کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہےکہ اس کی تالیف میں رشید نے متعدد فنی کتابوں سے مدد لی ہے۔ «شعرائے پارسی»[1] اور «عجم»[2] کے الفاظ سے اور ایک عبارت[3] سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان کتابوں میں کئی کتابیں فارسی کی تھیں جو ہم تک نہیں پہنچیں۔ ردیف کو رشید خالص فارسی شعرا کی صنعت کہتا ہے اس کے متعلق اس نے تین قول نقل کیے ہیں[4]۔ ایک یہ کہ «این شعر را اهل صناعت مردف خوانند» دوسرا یہ‌کہ «این کلمه ردیف را بعضی از اهل صناعت حاجب خوانند» تیسرا یہ کہ «و بعضی گفته اند که حاجب آن کلمه باشد کی او را پیش از قافیت بیارند» یہ اقوال فارسی صنعت کے متعلق ہونے کے سبب سے فارسی مصنفین ہی کے ہوسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ «الابداع» کی نسبت رشید لکھتا ہے کہ «مثالی از آنچ قدما در کتب خویش آورده اند آوردم»[5] اور یہ لکھ کر مثال میں قدما کی کتابوں سے عربی کے ساتھ فارسی‌کے شعر بھی نقل کرتا ہے۔ یہاں اس نے توضیح کردی ہے کہ اس کے مآخذ میں قدماء کی عربی فارسی کتب فن ہیں۔ ان شواهد سے یہ بات یقین کی حد تک پہنچ جاتی ہے کہ عربی کے علاوہ فارسی کے قدیم مصنفین بدیع کی بھی متعدد کتابیں اس کے پیش نظر تھیں اور ان سے اس نے نقل و اقتباس کیا ہے۔ ان شواهد سے یہ شبهہ بھی بالکل رفع ہوجاتا ہے کہ اقوال جو کثیر تعداد میں ہیں رشید نےکسی ایک ہی عربی یا فارسی کی کتاب سے نقل کیے ہوں۔

کتب فن‌کے علاوہ رشید نے دواوین شعرا اور نظم کی دوسری کتابیں بھی «حدایق السحر» کے مآخذ کے طور پر استعمال کی ہیں۔ ان کتابوں سے اس نے امثلہ و شواهد نقل کیے ہیں۔ عربی کی ایسی کتابوں میں

(۱) حدایق السحر : ۱۸ (۲) حدایق السحر : ۷۰ (۳) حدایق السحر : ۷۹-۸۰
(۴) ایضاً : ۷۹-۸۰ (۵) ایضاً : ۸۳

اس نے «رسایل ابوالحسن اهوازی» ، «مقامات حریری» اور جراب الدوله کی کتاب کا ذکر کیا ہے ۔ بدیع الزماں همدانی ، نصر بن حسن مرغینانی ، اسمعیل بن عباد ، زمخشری ، ثعالبی اور باخرزی کی کتابوں کا ذکر تو اس نے نہیں کیا ہے لیکن مصنفین کے نام لیے اور ان سے شواهد نقل کرنے سے قیاس ہوتا ہے کہ اول الذکر تینوں کے رسایل اور زمخشری کی مؤلفات اور خاص طور پر ثعالبی کی «یتیمة الدهر» اور باخرزی کی «دمیة القصر» سے بھی رشید نے استفادہ کیا ہے ۔ ان کے علاوہ اس نے صنعت اعنات کے ذیل میں ابوالعلاء معرّی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کے ہر شعر میں اعنات سے کام لیا گیا ہے ۔

اسی طرح صنعت تشبیه میں علی بن عیسیٰ الرمانی متوفی (۳۸٤ھ) کی کتاب «اعجاز القرآن» کا نام لیا ہے جو قرآن کریم کی تشبیہات پر مشتمل ہے لیکن ان دونوں کتابوں کی نسبت یہ صراحت نہیں کی کہ ان سے اس نے شواهد نقل کیے ہیں یا نہیں ، صنعت اعراق میں جاحظ کا قول امرؤ القیس کی نسبت نقل کیا ہے لیکن اس کی کتاب کا نام نہیں لیا ہے ۔

«حدایق السحر» کے مطالب یا شواهد کے فارسی مآخذ میں رشید نے کسی کتاب کا نہ نام لیا ہے نہ ذکر کیا ہے ۔ «ترجمان البلاغة» کا نام دیباچے میں لیا ہے مگر یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس سے نقل و اقتباس کیا ہے ۔ اس کے علاوہ اپنے رسالۂ «تصحیفات» اور «متلونات» میں احمد منشوری کی «کنز الغرایب» کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن ان کے متعلق بھی یہ تصریح نہیں کی کہ ان سے نقل اقتباس کیا ہے یا نہیں ۔ اس کی بھی صراحت نہیں کی کہ یہ دونوں کتابیں فارسی کی ہیں یا عربی کی ۔ چونکہ دونوں کتابوں کا ذکر رشید نے عربی امثله کے بعد اور فارسی امثله کے سلسلے میں کیا ہے اور رشید نے کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ عربی امثله کے بعد فارسی امثله لائی جائیں ۔ اس سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں فارسی کی ہیں ۔ تصحیف کی مثال میں رشید نے اپنا ہی ایک شعر درج کیا ہے اور وہ عربی کا ہے ۔

فارسی و عربی کے کچھ امثلہ وشواھد رشید نے کتب بلاغت (معانی و بیان و بدیع) سے بھی نقل کیے میں[1] لیکن ان کتابوں کا نام نہیں لیا ھے۔

رشید نے فارسی کی امثلہ و شواھد میں اپنے علاوہ حسب ذیل شعراء کا نام لیا ھے : رودکی، منطقی، منوچہری ، معزی ، عنصری ، نظنزی ، غضایری ، زینبی، فرخی، ابو المعالی رازی. منجیک ، عمعق بخاری ، قطران تبریزی، ابوالفرج رونی ، مسعود سعد ، مسعود رازی، عمید کمالی ، دقیقی ، امیر علی پوزی‌نگین، انباری ، بونصر شادی ، ابوالعلاء شوستری ، محمد بن عبده ، احمد مشوری ، ابوالفتح ستی ، علی‌اسدی، خسروی ، ازرقی .

عربی‌نثر اور شعر دونوں کے شواھد میں ثعالبی ، نصر بن حسن مرغینانی ، حریری، اسمعیل بن عباد کا اور خود اپنا نام لیا ھے .

عربی شعر کے شواھد میں : بوفراس همدانی، غزّی، مؤملی کاتب ، ابوالفتح ستی ، ابو بکر قہستانی ، نوقانی ، بریدی ، ادیب ترک ، سری‌الرفا موصلی ، ابو تمام ، متنبی ، ابن المعتز ، ابوالعلاء معری ، ابیوردی ، مسعود سعد سلمان، شبل الدوله ، نابغه ذبیانی ، نابغهٔ جعدی ، بدیع الزمان همدانی ، جریر ، بحتری ، بوعثمان خالدی ، بلمعانی شاہور ، بلفرج وأوا الدمشقی ، بلفرج هندو ، قاضی منصور هروی ، عباس بن عبد المطلب ، کثیر، لبید ، قیس مجنون ، زهیر ، باخرزی ، قاضی یحیی ، امیر ابو احمد عبد الله بن عبد الله بن طاهر ، امروٴالقیس ، فیاض ، جارالله زمخشری اور بوسعد رستمی کا نام لیا ھے .

« حدایق السحر » کے موضوع کے متعلق بعض مصنفین نے ایک سخت غلط فہمی پیدا کردی ھے ، انہوں نے اس کا موضوع عروض بتایا ھے[2] یا کم سے کم اس کے موضوع میں عروض کو بھی شامل سمجھا ھے ، حالانکہ اس کتاب میں عروض کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ھے .

رشید وطواط نے « حدایق‌السحر » کے دیباچے میں ایک اور کتاب

---

(۱) حدایق السحر : ۸۳

(۲) مقدمهٔ غیاث اللغات از ملا غیاث الدین رام پوری؛ قواعد العروض از قدر بلگرامی .

«حدایق‌السحر» سے زیادہ مبسوط تالیف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے
وہ لکھتا ہے :

«واگر در اجل تاخیر باشد و روزگار مهلت دهد و تقدیر یزدانی
بروفق مراد انسانی رود کتابی خواهم ساخت محیط جمیع انواع
علم شعر از عروض و القاب و قوافی و محاسن و معایب نظم» .
معلوم نہیں رشید اپنا یہ ارادہ پورا کر سکا یا نہیں .

«حدایق السحر» مختصر ہے ، علوم شعر میں صرف ایک علم پر مشتمل ہے لیکن اس کتاب کا موضوع بہت وسیع ہے اور بہ لحاظ موضوع اس کی حیثیت وہی ہے جو شمس قیس کی «المعجم» کی ہے . اگر یہ کتاب رشید نے لکھی ہے تو بڑی مفصل اور مفید کتاب ہوگی مگر افسوس ہے کہ اس کا ذکر کہیں کسی ادبی کتاب میں نہیں ملتا ہے . جس سے خیال یہی ہوتا ہے کہ اس کا یہ ارادہ اس کے دل ہی میں رہا اور اس کتاب کی تالیف کا موقع اس کی درباداری کی مصروفیتوں نے نہ دیا لیکن جن فنون پر اس نے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے ان میں ایک فن «عروض» پر علیحدہ سے اس کے رشحات قلم موجود ہیں . ان کے طبع ہونے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر وہ قلمی نسخے کی شکل میں آج بھی محفوظ ہیں . یہ رشحات قلم کسی بڑی تصنیف کی شکل میں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت معمولی رسالے کی ہے . عروض پر رشید کے رسالے کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے[1] .

یہ دو ورق کا ایک بہت چھوٹا سا رسالہ ہے جو ایک مجموعے میں شامل ہے اور رشید وطواط سے منسوب ہے اس میں سولہ بحریں ہیں جو فارسی شعراء میں شایع رہی ہیں اس کا مقدمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

«الحمد لله رب العالمین و الصلوة والسلام علی خیر خلقه ، اما بعد این
کتاب عروض اشعار است که مولانا عالم فاضل استاذ الشعراء
رشید الدین محمد بن علی (؟) الوطواط نوشته و نظم کرده» .

(1) Charles Rieu, *Catalogue of the Persian Mss. in the British Museum* (London, 1883) ii, p. 191.

اس کا پہلا قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ در بحر ہزج سالم:

هزج را گر تمام ارکان همی خواهی از و مگذر
بگیر این قطعه را یاد و بکن این وزن را ازبر

یہ رسالہ چند شعروں کی ایک نظم ہے جس میں عروض کی اور زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ بحروں کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے کہ جس بحر کا وزن یا ارکان سمجھانے ہیں اس بحر میں شعر کہہ دیے گیے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس سے ہر بحر کے ارکان اور وزن کا اندازہ ہوجائے جیسے یہی شعر جو بحر ہزج مثمن سالم کے ارکان سمجھانے کے لیے تصنیف کیا گیا ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم ہی میں کہا گیا ہے۔ اس منظوم چھوٹے سے رسالہ کی کوئی فنی اہمیت نہیں ہے۔ یہ صرف چند شعروں کا مجموعہ ہے جو مختلف بحروں میں کہے گئے ہیں۔ دو ورق کی ایسی نظم میں اتنا بڑا استاد اور فاضل فن کی کیا داد دے سکتا ہے۔ اس نظم کو رشید کا محض ایک تفنن طبع سمجھنا چاہیے جو کسی مبتدی کے لیے عمل میں آگیا ہوگا۔ اس منظوم رسالہ کی نسبت یہ ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ رشید نے اپنے اس ارادے کی جزوی تعمیل کے طور پر لکھا ہے۔ جو عروض اور دوسرے علوم شعر پر مشتمل کتاب لکھنے کے متعلق اس نے ظاہر کیا ہے۔

مجھے تو اس رسالہ کا رشید الدین وطواط صاحب «حدایق السحر» کی تالیف ہونا بھی مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ نسخہ نویس نے رشید الدین کے نام میں اس کی ابنیت غلط لکھی ہے۔ رشید صاحب «حدایق السحر» کے پورے سلسلۂ نسب میں کسی ایک بھی مورث کا نام «علی» نہیں ہے۔

عروض پر رشید کی اس مشتبہ اور مبتدیانہ تصنیف کے علاوہ اس کی ایک اور تصنیف کا بھی سراغ ملا ہے۔ اس تصنیف کی حیثیت بھی ایک رسالے کی ہے۔ یہ رسالہ ابھی طبع نہیں ہوا ہے۔ اس کی اطلاع مجھے ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری کی کتاب «تحقیق انتقادی در عروض پارسی» سے ملی ہے ڈاکٹر پرویز کا شمار اس صدی کے نمایاں ایرانی فضلاء میں ہے،

انھوں نے عروض پر تحقیقی کام کیا ھے اس فن پران کی یہ دوسری کتاب ھے اس میں فنی رجحانات کی تنقید کی گئی ھے اور مصنف نے عروض کو مختصر کرنے کے لیے ایک ایسا طریقہ بھی تشخیص اوزان و بحور کے لیے پیش کیا ھے. اس کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ھے جس سے مصنف نے کتاب کے مراجع و منابع کا کام لیا ھے. ان مراجع و منابع میں یورپین زبانوں کی کتابیں بھی شامل ھیں اور فارسی و عربی کی کتابیں بھی. فارسی و عربی کتابوں کی فہرست مغربی زبانوں کی کتابوں سے علیحدہ دی ھے. مراجع و منابع کے عنوان کے ذیل میں کتب فارسی و عربی کا جو ذیلی عنوان قایم کیا ھے. اس میں رشید کے رسالۂ عروض کا اس طرح ذکر کیا ھے:

«رسالة فی فن العروض من تصانیف مولانا رشید الدین الوطواط (نسخۂ قلمی)».

خانلری کی کتاب میں اس عبارت کے سوا اورکہیں اس رسالے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ھے. خانلری نے یہ بھی نہیں بتایاکہ یہ قلمی نسخہ کہاں ھے. اس کا کوئی مستقل نام بھی اس عبارت سے معلوم نہیں ھوتا. یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ عبارت اس رسالے کے تعارف کے لیے خانلری نے اپنی طرف سے لکھی ھے یا خود اس قلمی نسخے پر اس رسالےکے تعارف یا نام کے طور پر یہ عبارت لکھی ھوئی تھی اور وھی خانلری نے نقل کردی ھے۔

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسالہ وھی نظم ھے جو برٹش میوزیم کے کتبخانے میں ھےاور جس کا ذکر Rieu کی فہرست کے حوالے سے اوپر درج ھوا ھے یا اس سے مختلف ھے لیکن قیاس یہ ھے کہ یہ رسالہ برٹش میوزیم کے منظوم رسالے کے علاوہ ھے. منظوم رسالہ جیسا ابھی کہا جاچکاایک مبتدیانہ کوشش ھے اور اتنا مختصر ھے کہ کسی بڑی کتاب میں اس سے اخذو استفادہ کرنا مشکل ھے. زیر نظر رسالے کو خانلری، نے اپنی کتاب کے مآخذ میں شمار کیا ھے. اس لیے یہ سمجھنا چاھیے کہ انھوں نے «تحقیق انتقادی» میں اس رسالہ سے بھی فایدہ اٹھایا ھے. اگرچہ یہ بھی ممکن ھے کہ اس رسالے کی اھمیت کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے مصنف (رشید وطواط)

کی اھمیت کی بنا پر خاطری نے اس رسالے کا ذکر کیا ھو اور متن کتاب کے مطالب کے لیے محض کوئی جزوی استفادہ رسماً اس رسالے سے کیا ھو. ان قراین سے مجموعی اثر ذھن پر یہی مترتب ھوتا ھے کہ یہ رسالہ منظوم رسالے کے علاوہ اور اس سے زیادہ اھم ھے اس رسالے کی نسبت بھی یہ ماننے کو طبیعت آمادہ نہیں ھوتی کہ یہ رشید وطواط کے اس ارادے کی جزوی تعمیل ھے جو اس نے جملہ علوم شعر پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کے متعلق ظاھر کیا ھے.

محمد بن قیس:

یہ ساتویں صدی ھجری میں علم بدیع کا سب سے اھم مصنف ھے جو عروض کا بھی ماھر ھے اس کی تصنیف کا نام «المعجم فی معاییر اشعار العجم» ھے. یہ کتاب صرف علم بدیع پر نہیں ھے بلکہ اس میں علم عروض اور علم قوافی بھی شامل ھے. اس کے حالات زندگی کسی کتاب میں نہیں ملتے ھیں چنانچہ قزوینی «المعجم» کے مقدمے میں لکھتے ھیں «از ترجمۂ حیات و شرح حال مصنف این کتاب . . . در ھیچ یک از کتب تاریخ و تذکرہ اطلاعی بدست نیامدہ اس کتاب کے دیباچہ اور اصل کتاب کے ایک آدھ مقام سے جو کچھ حالات اس مصنف کے معلوم ھوتے ھیں وہ یہ ھیں:

مصنف «رے» میں پیدا ھوا. اولاً خوارزمشاھی دربار سے اس کا تعلق رھا اور محمد بن تکش خوارزمشاہ (۵۹۶-۶۱۷ ھ) کا وہ ملازم تھا ۶۰۱ ھ سے پانچ چھ سال تک بخارا میں رھا بعد میں مرو پہنچا. ۶۱٤ ھ میں مرو میں تھا. اسی زمانہ میں محمد بن تکش عراق کی طرف روانہ ھوا تو خود وہ بھی بادشاہ کے همرکاب ھوا اور اس کے ساتھ مرو سے عراق میں آیا. یہاں پھر اپنے وطن «رے» کی سکونت اختیار کرنی چاھی اور اھل وعیال اور گھر بار کو خوارزم و خراسان سے رے میں منتقل کرلینے کا ارادہ کیا. ۶۱۷ ھ میں رے پہنچا. مصنف عراق میں تھا کہ تتاریوں کا حملہ شروع ھوگیا اور انہوں نے ماوراالنہر خوارزم اور خراسان کو تاخت و تاراج کردیا. ۶۱۷ ھ میں قلعۂ فرزین میں تتاریوں کے مقابلہ میں خوارزمشاہ کو شکست ھوئی تو مصنف بادشاہ کے همرکاب تھا. مصنف نے بادشاہ کا

عراق کے لیے روانہ ہونا اور اپنا «مرو» سے بادشاہ کے ساتھ نکلنا اور عراق پہنچنا اور قلعۂ فرزین کی جنگ میں اس کے ساتھ ہونا، یہ واقعات اس طرح بیان کیے ہیں کہ مصنف اور بادشاہ دونوں کا عراق پہنچنا اور ٦١٤ھ سے ٦١٧ھ تک دونوں کا عراق میں مسلسل رہنا ظاہر ہوتا ہے. مگر یہ غلط ہے. مصنف عراق پہنچا اور وہیں رہ پڑا مگر بادشاہ راستہ سے واپس ہوگیا. جب ٦١٧ھ میں تتاریوں کے حملہ سے جان بچاکر دوبارہ بادشاہ عراق کی طرف روانہ ہوا ہے. اس وقت عراق میں پھر مصنف بادشاہ کا همرکاب ہوا اور اسی همراهی میں قلعۂ فرزین کی جنگ پیش آئی.

مصنف دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اگرچہ ٦٣٠ھ میں فتنۂ تتاری کی طرف سے بیشتر ممالک اسلامیہ کو امن حاصل ہوگیا تھا اور بادشاہ کے بعض فرزندوں کی طرف سے قیام امن کی امید پیدا ہوچلی تھی لیکن چونکہ اس نے متعدد شہروں میں اپنی آنکھوں سے تتاریوں کے ہاتھوں قتل عام دیکھا تھا اور خود بھی دو ایک بار رہے کے شحنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا اور بمشکل جانبر ہوا تھا. اس کو عراق کی حالت سے اطمینان نہیں ہوتا تھا اور تتاریوں کی مراجعت کا خوف اس کے دل سے نہیں نکلتا تھا آخر ان حالات سے تنگ آکر راستوں کے خطرناک ہونے کے باوجود مصنف عراق سے فارس چلا گیا.

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فتنۂ تتار کے زمانہ میں عراق کے متعدد شہروں میں منتقل ہوتا رہا اور خود رے میں بھی رہا. غالباً یہ وہ حالت ہوگی کہ جب تتاری خوارزمشاہ ان کے ڈر سے شہر شہر مارا مارا پھر رہا تھا. مصنف اس وقت بادشاہ کے همرکاب ہوگا. اور اسی کے ساتھ شہر به شہر منتقل ہوتا رہتا ہوگا. اور اسی همراهی میں قلعۂ فرزین کا مقابلہ مصنف کی نظر سے گذرا ہوگا. اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٦٢٥ھ تک مصنف عراق ہی میں رہا اور ٦٢٠ھ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں وہ عراق سے فارس میں منتقل ہوا. لیکن صحیح سال فارس میں اپنے منتقل ہونے کا اس نے نہیں لکھا ہے.

فارس پہنچکر اس نے بادشاہ فارس اتابک سعد بن زنگی کی ملازمت اختیار کرلی اور دارالخلافہ شیراز میں سکونت پذیر ہوا بادشاہ نے اس کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور مصنف بہت جلد اس کے مقربان خاص میں داخل ہوگیا اور حاجب کے عہدہ پر مامور ہوگیا اس کا شمار خاص حاجبوں میں ہوتا تھا۔ مصنف پانچ سال اس بادشاہ کی ملازمت میں رہا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی کے زمانہ میں بھی مصنف شیراز میں رہا۔ اور اسی کے زمانہ میں کتاب « المعجم فی معاییر اشعار العجم » مکمل کی اور اسی کے نام سے منسوب کی۔ دیباچہ کی تحریر کے وقت مصنف نے ابوبکر بن سعد زنگی کی تسخیر ممالک اور توسیع سلطنت کے متعلق لکھا ہے کہ اب تک بحرین، عمان، کیش، اور خلیج فارس کے تمام بندرگاہ، جزیرے اور آبادیاں جو آب بصرہ سے سواحل ہند تک واقع ہیں تسخیر ہوکر ملک فارس میں شامل ہوچکی ہیں۔ یہ توسیع و تسخیر قاضی احمد غفاری کی « تاریخ جہاں آرا » کے مطابق ابو بکر کے سال جلوس یعنی ۶۲۸ ھ کے واقعات ہیں۔ لہذا مصنف ابو بکر کے زمانۂ حکومت میں ۶۲۸ ھ تک زندہ تھا اور شیراز میں موجود تھا۔

قزوینی مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ اور تاریخوں میں ان فتوحات کا سن نہیں لکھا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتوحات جلوس ابوبکر کے چند سال بعد ہوئی ہیں۔ اول تو قزوینی نے کوئی قرینہ نہیں لکھا ہے۔ پھر کوئی تاریخی شہادت بھی ان کی رائے کی تائید نہیں کرتی ہے۔ اس لیے قزوینی کی رائے ماننے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اگر ان کی رائے مان لی جائے تو ہمارے علم میں مصنف کے قیام شیراز کی مدت ایک آدھ سال تک اور بڑھ جاتی ہے یعنی ۶۲۹ ھ یا ۶۳۵ ھ تک وہ شیراز میں موجود تھا۔ بہرحال ۶۲۸ ھ یا ۶۳۵ ھ کے بعد کے حالات مصنف کے متعلق اس کی اس کتاب سے بھی نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ ان مختصر اور منتشر حالات کے سوا ہمیں مصنف کی زندگی کے متعلق کچھ علم نہیں۔

قزوینی نے مقدمہ میں مصنف کے عراق سے فارس منتقل ہونے اور

سعد بن زنگی کی ملازمت اختیار کرنے کا سال ۶۲۳ھ متعین کیا ہے۔ مصنف نے یہ سن خود نہیں لکھا ہے۔ اس کے لیے قزوینی کا استدلال یہ ہے کہ سعد بن زنگی کی وفات کے بعد مصنف اس کے فرزند ابو بکر کی ملازمت میں بدستور رہا ہے اور چونکہ سعد بن زنگی کا سن وفات ۶۲۸ھ ہے اور وہی ابو بکر کا سال جلوس ہے اور مصنف نے سعد بن زنگی کی وفات تک اس کے دربار میں اپنی مدت ملازمت پانچ سال لکھی ہے۔ اس لیے مصنف کا قیاس پہنچتا اور سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم ہونا ۶۲۸ھ سے پانچ سال پہلے یعنی ۶۲۳ھ میں ثابت ہوتا ہے۔ قزوینی کی یہ رائے اور ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے اس استدلال کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مصنف کا سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم رہنا سعد بن زنگی کی وفات تک ثابت ہو یا یہ ثابت ہو کہ مصنف نے ابو بکر کی بھی ملازمت کی۔ ان دونوں میں سے ایک واقعہ بھی صحیح نہیں ہے۔ مصنف نے یہ ضرور لکھا ہے کہ وہ پانچ سال تک سعد بن زنگی کا ملازم رہا لیکن قزوینی نے یہ غلط لکھا ہے کہ مصنف نے اپنی یہ مدت ملازمت سعد بن زنگی کی وفات تک لکھی ہے۔ مصنف نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے ابو بکر کے دربار میں اپنا ملازم ہونا بھی مصنف نے کہیں نہیں لکھا ہے۔ مصنف کے دیباچہ میں دو موقعوں پر ابوبکر کے حق میں دعا و ثنا ملتی ہے۔ ایک موقع پر جب فارس میں آنا اور سعد بن زنگی کی ملازمت اختیار کرنا بیان کرتا ہے تو سعد بن زنگی کی دعا و ثنا کرتا ہے اور اس کی دعاء مغفرت کے سلسلے ہی میں ابوبکر کے حق میں دعاء درازی مدت اور اس کی مدح سرائی شروع کردیتا ہے جو دس گیارہ صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے دوسرے موقع پر جب کتاب کی تکمیل و تسمیہ کا ذکر کرتا ہے تو پھر ابوبکر کی دعا و ثنا کرتا ہے جو ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر اپنی کتاب بھی اس کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ اس طویل مدح کے باوجود جو مصنف ابوبکر کی کرتا ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھتا ہے کہ وہ ابوبکر کا ملازم ہے۔ حالانکہ سعد بن زنگی کا ذکر آیا تھا تو مصنف نے اچھی طرح

اور تفصیل سے اس کے دربار میں اپنا ملازم ہونا بیان کردیا تھا۔ ابوبکر کی اس مدح و ثنا میں جو الفاظ زیادہ سے زیادہ اس قیاس میں مدد کرسکتے ہیں کہ وہ ابوبکر کا بھی ملازم تھا یہ ہیں:

«طراز آغاز آن (کتاب) دعاء دولت و ثناء حضرت خداوندزاده ... سلغرشاه بن سعد ... ساخته و بنام مبارکش پرداخته چه میل طبع لطیفش بمطالعهٔ لطائف کتب دانسته ام و التفات خاطر عاطرش بمطالعهٔ نوادر علوم دیده ... و امیدوارم که به میامن دعاء این خاندان بادشاهی و دولت و برکت حق گذاری ممت این دودمان غریب نوازی و عاطفت از وقیعت طاعنان مصون ماند»۔

یہ اس مدح کے الفاظ ہیں جو دوسرے موقع پر کی گئی ہے۔ یہ الفاظ ہرگز اس قیاس کے لیے کافی نہیں ہیں کہ مصنف ابوبکر کا ملازم تھا۔ مصنف کا یہ لکھنا کہ اس کو بادشاہ کے مطالعہ کتب کے شوق کا علم ہے۔ اس پر بھی مبنی ہوسکتا ہے کہ اہل ملک خصوصاً خواص بادشاہ کے رجحانات سے درباردای کے تعلق کے بغیر واقف ہوتے ہیں مصنف کا یہ لکھنا کہ مطالعهٔ علوم کی طرف اس نے بادشاہ کا التفات خاطر دیکھا ہے۔ اس پر بھی مبنی ہوسکتا ہے کہ جب مصنف ابوبکر کے باپ کا ملازم تھا اور ابوبکر اس وقت شہزادہ تھا۔ اس وقت بادشاہ کا یہ التفات خاطر دیکھنے کے اتفاقات ہوتے رہے ہوں گے یا اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مان لیا جائے کہ مصنف ابوبکر کے بادشاہ ہوجانے کے بعد کبھی کبھی اس کے دربار میں بلایا جاتا تھا۔ دربار کی آمد و رفت کے لیے ملازمت کا تعلق ضروری نہیں ہے۔ بہر حال مصنف ابوبکر کے باپ کے امراء میں تھا۔ پھر دارالخلافہ میں ہی مقیم تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی دربار میں آمد ورفت رہی ہوگی کسی شخص کا اپنے آپ کو کسی بادشاہ کے خاندان کا دعاگو اور اس خاندان کی نعمتوں کا حق گذار کہنا اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایسا شخص اس بادشاہ کا ملازم ہے۔ یہ عام بات ہے اور تعلق خدمت کے بغیر بھی اس طرح کی بات بادشاہ کے حق میں ہر

ثناہ خواں کہہ سکتا ہے ۔ اور کہتا ہے ۔ اور پھر مصنف کو تو اس لیے بھی کہنا چاہیے کہ وہ بادشاہ کے باپ کا ملازم رہا ہے اور اس پر اس کے باپ کا حق نمک ہے اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب ابوبکر کے نام سے منسوب کی ہے ۔ یہ نسبت بھی ملازمت کا ثبوت نہیں ہوسکتی بہت سے مصنفین بادشاہوں کے نام پر کتابیں لکھتے تھے حالانکہ وہ ان بادشاہوں کے ملازم نہیں تھے یہ اس زمانے کی عام رسم تھی کہ جس طرح کتاب کا حمد و نعت سے شروع ہونا ضروری تھا اسی طرح سبب تالیف تک پہنچتے پہنچتے بادشاہ وقت کی مدح کرنا اور کبھی کبھی اس کے نام سے کتاب کو منسوب کرنا بھی ضروری تھا ۔ یہ گویا تصنیف و تالیف کے آداب تھے ۔

مصنف کا یہ لکھنا کہ اگرچہ ۶۲۰ ھ میں تتاریوں کے طرف سے امن ہوگیا تھا مگر عراق کے انقلاب اور گذشتہ واقعات سے وہ اتنا گھبرا گیا تھا کہ عراق سے فارس چلا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قیام امن اور مصنف کی فارس میں منتقلی ایک ہی زمانہ یعنی ۶۲۰ ھ کے واقعات ہیں ۔ اگر یہ دو علیحدہ واقعے ہیں تو اپنی روانگی فارس کے سلسلہ میں مصنف کو ۶۲۰ ھ کے قیام امن یا تحمیف بدامنی کے ذکر کی کیا ضرورت تھی ۔ خصوصاً جبکہ بدامنی کی کمی اس کی روانگی فارس کا محرک بھی نہیں ہوسکتی ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ۶۲۵ ھ کو اپنی روانگی فارس کا سال بتانا چاہتا ہے ۔ اور تحمیف بدامنی کا ذکر جو خود بھی اس سن کا واقعہ ہے جملہ معترضہ کے طور پر کر گیا ہے ۔

مصنف کا یہ بیان اور اس کا یہ نتیجہ نیز اس کا سعد بن زنگی کی ملازمت کا ذکر کرنا اور ابوبکر کی ملازمت کا ذکر نہ کرنا ، سعد بن زنگی کے دربار میں اس کی پنج سالہ مدت ملازمت کے متعلق یہ صراحت نہ ملنا کہ وہ سعد بن زنگی کی وفات تک ختم ہوتی تھی ان واقعات کو ملاکر دیکھئے تو دو نتیجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ مصنف کا فارس منتقل ہونا اور سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم ہونا ۶۲۰ ھ کا واقعہ ہے ۔ دوسرا یہ کہ وہ

ابوبکر کے دربار میں ملازم نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ۶۲۰ ھ سے ۶۲۵ ھ تک سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم رہا۔ اس کے بعد ملازمت دربار داری کے فرائض سے سبکدوش ہوکر خانہ نشین ہوگیا نہ اس کے بعد سعد بن زنگی کے زمانہ میں اس نے ملازمت اختیار کی نہ ابوکر کے زمانہ میں۔

« المعجم » مدتوں کمیاب رہی ۔ اس کے صرف چند قلمی نسخے کتبخانوں میں محفوظ ہیں ۔ یہ پہلی بار پروفیسر ادوارد براؤن کی سعی اور ان کے لائق شاگرد مرزا محمد خان معروف بہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی تصحیح و تحشیہ اور مقدمہ کے ساتھ ۱۳۲۷ ھ مطابق ۱۹۰۹ میں مطبع کاثولیکیہ بیروت میں طبع ہوکر شائع ہوئی ۔ قزوینی نے اسے تین قلمی نسخوں کی مدد اور مقابلہ سے مرتب کیا ہے ۔ برٹش میوزیم لندن کا نسخہ، کتبخانۂ خدا بخش خان بانکی‌پور (پٹنہ) کا نسخہ، کتبخانۂ ایا صوفیہ استانبول کا نسخہ اس اشاعت کا اصلی مبنی برٹش میوزم کا نسخہ ہے ۔

دوسری بار یہ کتاب مدرس رضوی استاد دانشگاہ تہران نے خرداد ۱۳۳۸ ھ میں دانشگاہ کے مطبع میں طبع کراکے شائع کی یہ قزوینی ہی کے مرتبہ نسخہ کی دوسری اشاعت ہے ۔ قزوینی کے مقدمہ، حواشی اور متن کو قائم رکھتے ہوئے اس پر صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ قزوینی کے مرتبہ نسخہ کا مقابلہ چھ اور قلمی نسخوں سے کرکے جن میں پانچ ابھی ایرانی کتبخانوں میں مل گئے تھے ۔ اور ایک یاصوفیا کے کتبخانہ کا عکس ہے نسخوں کے اختلافات اور بدل کے متعلق کچھ حواشی اپنی طرف سے بڑھا دیے ہیں نیز بعض الفاظ کے معانی حاشیہ میں دیدیے ہیں۔ قزوینی کے مرتبہ متن میں قلم نہیں لگایا ہے ۔ سوا ان چند مقامات کے جہاں کوئی غلطی یا سقوط بہت نمایاں تھا اورکسی قلمی نسخہ سے درست ہوسکتا تھا۔ قزوینی کے مقدمہ کے علاوہ ایک مقدمہ خود بھی لکھ‌کر شامل کتاب کیا ہے۔ میرے سامنے یہ دوسری اشاعت ہے ۔ اس کتاب پر عبدالوہاب قزوینی اور مدرس رضوی دونوں کے مقدمے ہیں اور ضروری معلومات پر مشتمل ہیں۔

یہ کتاب موضوع کے لحاظ سے تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ عروض

قافیہ اور علم شعر (نقد شعر) تیسرے حصے میں صفحہ ۳۲۸ سے صفحہ ٤۳۱ تک علم بدیع ہے اور یہی اس وقت ہمارا اصلی موضوع ہے ۔ اس طرح علم بدیع پر اس کتاب میں ۱۵۳ صفحے ہیں ۔

«المعجم» کا سن تصنیف، موضوع اور نام بھی تفصیل چاہتا ہے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ٦١٤ ھ میں جب وہ مرو میں تھا۔ اس کے ایک دوست نے اُس کو توجہ دلائی کہ عربی اور فارسی شاعری کے معاییر (اصول) اور محاسن و معایب پر ایک کتاب لکھے اسکی فرمائش پر مصنف نے فوراً عربی و فارسی اشعار کے عروض قوافی اور فن نقد پر کتاب لکھنی شروع کردی اور اس کے ابواب کا ایک خاکہ تیار کرلیا۔

اس کے بعد کام رکا رہا ٦١٧ ھ میں قلعۂ فرزین کی جنگ میں یہ ناتمام کتاب جو مصنف کے ساتھ تھی تمام کی تمام کھوگئی اور بہت مدت کے بعد اس کے صرف چند اجزاء اس علاقہ کے بعض کسانوں سے مصنف کو دستیاب ہوئے ۔ مصنف شیراز پہنچا تو یہی چند اجزاء اس ناتمام کتاب کے اس کے پاس محفوظ تھے ۔

شیراز میں ابو بکر کے دور حکومت میں فضلاء شیراز نے مصنف پر زور دیا کہ وہ اس کی تکمیل کرے چنانچہ مصنف نے اس کی تکمیل کی طرف توجہ کی اور تھوڑی ہی مدت میں کتاب مکمل کردی ۔ اس طرح اس کتاب کی تصنیف ٦١٤ ھ میں شروع ہوئی ۔ ٦١٤ھ سے ٦٢٨ ھ تک اس کی تکمیل رکی رہی ۔ کتاب عربی زبان میں تھی اور اس میں بحث عربی اور فارسی دونوں کے فنون ثلاثہ (عروض، قافیہ، اور نقد شعر) سے کی گئی تھی اس طرح کہ عربی شاعری کے مباحث کی مثال میں عربی شعر پیش کیے گئے تھے ۔ یعنی مطالب کی عربی عبارت کے ساتھ شواھد فارسی اور عربی اشعار کے مربوط کیے گئے تھے ۔ کتاب کی تکمیل کے بعد مصنف کے بعض احباب نے درخواست کی کہ اس کتاب میں سے فارسی کے فنون ثلاثہ کے مباحث اور اشعار الگ الگ کرکے ایک دوسری کتاب میں جس کی عبارت فارسی ہی میں ہو جمع کردینے چاہئیں ۔

مصنف نے اس طبقۂ احباب کی یہ درخواست قبول کی اور اس بڑی کتاب میں جتنے مباحث فارسی شاعری کے ان فنون ثلاثہ سے متعلق تھے اُنہیں اس مختصر کتاب میں جمع کردیا. اور اس کا نام «المعجم فی معاییر اشعار العجم» رکھا.

مصنف کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جن فنون پر زیر نظر کتاب «المعجم» مشتمل ہے انہیں فنون پر اولاً اس نے بڑی کتاب تصنیف کی تھی جو عربی اور فارسی دونوں کی شاعری سے متعلق تھی بعد میں اس بڑی کتاب سے وہ مباحث جو فارسی شاعری سے متعلق تھے الگ کرکے فارسی میں ترجمہ کردیئے اور بڑی کتاب کے فارسی اشعار کے شواھد بھی اس ترجمہ کے ساتھ جمع کردیئے. اس ترجمہ کا نام اس نے «المعجم فی معاییر اشعار العجم» رکھا. اس طرح «المعجم» مصنف کی بڑی کتاب کا اختصار اور فارسی ترجمہ ہے اور صرف فارسی شاعری کے فنون پر مشتمل ہے. بڑی کتاب مصنف نے ٦١٤ ھ میں لکھنی شروع کی تھی جس کی تکمیل ابوبکر کے زمانہ تک جاری رہی. ابوبکر کے زمانہ میں اس کی تکمیل کا مصنف کو دوبارہ خیال آیا. دیباچہ میں مصنف نے ابوبکر کی حدود حکومت کی توسیع بحرین، عمان، کیش اور خلیج فارس کے تمام بندرگاہ اور جزیروں تک لکھی ھے. یہ واقعہ قاضی احمد غفاری کے مطابق ٦٢٨ ھ کا ھے اور یہی ابوبکر کا سال جلوس ھے. اس لیے ٦١٤ ھ کے بعد مصنف نے بڑی کتاب کی تکمیل کی طرف دوبارہ توجہ ٦٢٨ ھ میں کی اور اسی ٦٢٨ ھ میں اسے مکمل کردیا. لہذا بڑی کتاب کا زمانۂ تصنیف ٦١٤ ھ تا ٦٢٨ ھے. اس چھوٹی کتاب «المعجم» کا سن تصنیف ایک لحاظ سے صرف ٦٢٨ ھ کو کہہ سکتے ھیں کہ اسی سال میں بڑی کتاب مصنف نے مکمل کی اور اسی سال اس کی تکمیل کے بعد اس سے مقتبس کر کے «المعجم» مرتب کی. لیکن اس لحاظ سے کہ اس کے اصل مآخذ کی تصنیف ایک حد تک ٦١٤ ھ میں ھوچکی تھی اور اس وقت سے «المعجم» کے مضامین بڑی کتاب میں موجود تھے. «المعجم» کا زمانۂ تصنیف بھی وھی ھے جو بڑی کتاب کا یعنی ٦١٤ ھ - ٦٢٨ ھ مصنف کے اس بیان سے یہ بھی قیاس ھوتا ھے.

کہ جس طرح اس نے بڑی کتاب میں سے مقتبس کرکے ایک علیحدہ کتاب عربی شاعری کے انہیں فنون ثلاثہ پر مرتب کی ہوگی اور اس کا نام «المعجم» کے مقابلہ پر تناسب ترکیب کے لحاظ سے «المعرب فی معاییر اشعار العرب» رکھا ہوگا ۔ اصل بڑی کتاب بھی جو عربی اور فارسی دونوں کے فنون ثلاثہ پر مشتمل تھی دستور رہی ہوگی اور اس کے نام میں دونوں زبانوں کی رعایت ہوگی لہذا ان فنون ثلاثہ پر مصنف کی تین کتابیں ہونی چاہئیں ۔ ١۔ اصل بڑی کتاب ٢۔ بڑی کتاب کا فارسی ترجمہ و اقتباس یعنی المعجم ٣۔ بڑی کتاب کا عربی اقتباس ۔ اس قیاس کی تائید «المعجم» کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے ۔ بحر مشاکل کے بیان میں مصنف ایک وزن میں بعض شعراء کا مشاکل اور ہزج کو مخلوط کرنے کا عمل غلط بتاتے ہوئے «المعجم» کے صفحہ ۱۷۵ پر لکھتا ہے :

«و من چون درین فن شروع کردم و در تالیف کتاب الکافی فی العروضیین و القوافی بدین فصل رسیدم کافۂ فضلاء و عامۂ شعراء فارس و عراق باتفاق دربن باب (یعنی اس خلط کے غلط ہونے کے بارے میں) مرا خلاف کردند و بر تصویب ایشان و تخطیۂ من اصرار نمودند» ۔

یہاں مصنف نے اپنی کتاب «کتاب الکافی فی العروضیین و القوافی» کا ذکر کیا ہے ۔ اس مقام کے سوا اور کہیں اس کتاب کا ذکر نہیں آیا ہے ۔ اس کتاب کے نام میں عروضیین کا صیغہ تثنیہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ کتاب عربی اور فارسی دو زبانوں کے فن سے متعلق ہے ۔ نیز «بدین فصل رسیدم» کے فقرہ سے ظاہر ہے کہ «المعجم» کی جس فصل یعنی مشاکل میں یہ عبارت مصنف نے لکھی ہے ۔ مصنف کی کتاب «کتاب الکافی» میں بھی اس موقع پر یہی فصل ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو ابواب و فصول (مباحث) «المعجم» میں ہیں وہی «الکافی» میں ہیں ۔ مصنف نے اپنی بڑی کتاب کے بارے میں بھی یہی لکھا ہے کہ اس کے مباحث وہی ہیں جو «المعجم» کے ۔ اور اس میں اور «المعجم» میں صرف یہ فرق ہے کہ «المعجم» صرف فارسی زبان کے نمونوں کے متعلق ہے اور بڑی کتاب فارسی اور عربی دونوں زبانوں

کے فنون سے تعلق رکھتی ہے لہذا یہی «کتاب الکافی فی العروضین و القوافی» مصنف کی وہ بڑی کتاب ہے جس کا اختصار اور ترجمہ «المعجم» ہے۔ «کتاب الکافی» کو مصنف کی بڑی کتاب اور «المعجم» کا مآخذ سمجھنے میں ایک یہ شبہہ حائل ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی کتاب کو دو زبانوں کے فنون ثلاثہ یعنی عروض، قوافی اور نقد شعر پر مشتمل بتایا ہے۔ اور «المعجم» کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نقد شعر میں اکثر علم بدیع کا حصہ ہے اس لیے «الکافی» میں بھی دو زبانوں کے عروض، قوافی اور علم بدیع یا نقد شعر تینوں فن ہونے چاہییں. لیکن «الکافی» کے نام میں فن صرف دو مذکور ہیں اور تثنیہ صرف ایک فن (عروض) کا ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ شبہہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے. مجاز مرسل کی اقسام میں ایک قسم تسمیۃ الکل بالجزء بھی ہے. یہ ایک اسلوب بیان ہے جس کے رو سے کسی کل کا نام اس کے کسی جزو پر رکھا جاتا ہے اسی اسلوب پر مصنف نے اپنی اس کتاب کا نام رکھدیا. قوافی کا صیغہ کافی کے قافیہ کے لیے استعمال کیا اور عروضین سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جس طرح اس کتاب میں عروض دو ہیں یعنی دو زبانوں کے ہیں اسی طرح قوافی بھی دو زبانوں کے ہیں. قافیتین لانے میں یہ قباحت بھی تھی کہ اس سے دو زبانوں کے قافیوں کے فن کا مفہوم نکلنے کی بجائے یہ مفہوم زیادہ نکلتا ہے کہ کوئی دو مخصوص قافیہ مراد ہیں. یعنی دو ایسے لفظ مراد ہیں جو قافیہ کی حیثیت رکھتے ہیں.

«کتاب الکافی» سے مآخوذ دوسری چھوٹی کتاب جو عربی کے فنون پر مشتمل ہے میرے قیاس کردہ نام کے ساتھ دو جگہ «المعجم» میں مذکور ہے. ایک جگہ ص ۲۱۷ میں پورے نام سے دوسری جگہ ص ۲۷۳ میں مختصر نام سے. چنانچہ ص ۲۱۷ میں قافیہ کی بحث میں فارسی شعراء کے ایک التزام کا ذکر کرتے ہوئے عربی شعرا کے التزام کا بھی ذکر کرتا ہے. اور عربی شعراء کے اس التزام کی توجیہ میں لکھتا ہے کہ «سبب و علت آں در کتاب المعرب فی معاییر اشعار العرب بیان کردہ ایم». ص ۲۷۳ میں قافیہ کی

بحث میں عربی اشعار کے « حدود قوافی » متکاوس، متراکب وغیرہ کی کیفیت استعمال فارسی اشعار میں بتانے کے سلسلے میں لکھتا ہے۔ « عدد قوافی در اشعار عرب سی و پنج است چنانک در کتاب معرب شرح داده آمده است» یہ « معرب » اسی « المعرب فی معاییر اشعار العرب » کا مختصر نام ہے۔

«المعجم» کا نام جیسا اوپر ذکر ہوچکا محمد بن قیس نے «المعجم فی معاییر اشعار العجم» ہی رکھا ہے۔ برٹش میوزیم اور کتبخانہ ذکاءالملک فروغی کے نسخوں کے کاتبوں نے بھی اس کا یہی نام لکھا ہے اکثر مصنفین بھی اس کا نام یہی لیتے ہیں یا اسے «المعجم» کہتے ہیں جو ظاہر ہے اسی نام کا اختصار ہے اور اس نام سے کوئی مختلف نام نہیں ہے لیکن مفتی سعد اللہ مرادآبادی اور سید غلام حسین قدر بلگرامی اس کا نام معیارالمعجم یا معیار معجم بتاتے ہیں۔

«المعجم» کے نام کے سلسلے کی ایک بحث اور رہ جاتی ہے اور وہ « حدایق المعجم » کی ہے۔ قزوینی لکھتے ہیں کہ «حدایق المعجم» کا ذکر مفتی محمد سعداللہ کی «میزان الافکار» اور صاحب «غیاث اللغات» کے رسالہ «معراج العروض» میں آیا ہے۔ اس بنا پر وہ اسے شمس قیس کی تصنیف کہتے ہیں انہوں نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست کے مرتب چارلس (Rieu) کے قول کے حوالہ سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً یہ کتاب «المعجم» کا اختصار ہے[1]۔ صاحب «غیاث اللغات» نے اسے اپنے رسالہ کے مآخذ مین شمار کیا ہے اور محمد بن قیس کی تصنیف بتایا ہے[2]۔ « المعجم فی معاییر اشعار العجم» کا کہیں نام نہیں لیا ہے تلاش سے «حدائق المعجم» کا ذکر قزوینی کی ان بتائی ہوئی دو کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً شرح قصائد انوری مصنفہ میر ابوالحسن حسینی فراہانی[3]، کتاب «کشاف

(۱) مقدمۂ المعجم : یا

(۲) مدرس رضوی نے مقدمہ المعجم میں یہ غلط لکھا ہے کہ معراج العروض میں بتکرار حدایق المعجم کا نام لیا گیا ہے حدایق المعجم کا نام اس رسالہ میں صرف ایک بار آیا ہے۔

(۳) مدرس رضوی «مقدمہ المعجم» میں لکھتے ہیں کہ اس شرح میں شمس قیس کی «حدائق المعجم» سے مطلب نقل کیے گئے ہیں۔

اصطلاحات الفنون» مصنفہ شیخ محمد علی فاروقی الحنفی التھانوی[1] «قواعد العروض» مصنفہ سید غلام حسنین قدر بلگرامی[2]. ان کتابوں میں «حدایق المعجم» کا جس طرح ذکر آیا ہے اس سے اس کتاب کے متعلق تین باتیں قطعی طور پر ثابت ہیں۔

۱۔ یہ کسی اور مصنف کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔

۲۔ شمس قیس اور المعجم سے اس کا ضرور کوئی تعلق ہے۔

۳۔ یہ شمس قیس کی کوئی مستقل تصنیف «المعجم» سے الگ اور اس کے علاوہ نہیں ہے۔

---

(۱) شیخ محمد علی بن علی بن القاضی محمد حامد بن محمد صابر الفاروقی الحنفی التھانوی، اس مصنف کی متذکرہ کتاب کے متعلق مدرس رضوی «مقدمۂ المعجم» میں لکھتے ہیں کہ اس کی جلد اوّل اسلامبول میں اور مکمل کتاب دوسری بار ہندوستان میں طبع ہوئی۔ عروض و قافیہ کے اصطلاحات اس میں شمس قیس کی حدائق المعجم سے نقل کی گئی ہیں

(۲) اس کتاب میں پہلی بار صفحہ ۴۹ پر زحاف تخنیق کے سلسلے میں حدائق المعجم کا نام اس طرح آیا ہے، کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ قدر صاحب کے نزدیک حدائق المعجم محمد بن قیس کی تصنیف ہے یا کسی اور کی۔ تخنیق کے تلفظ کے لیے صاحب «حدائق المعجم» سے استناد کیا ہے اور اس کی تعریف کے لیے «محمد بن قیس» سے۔ اس صورت میں محمد بن قیس سے مراد اس کی کتاب المعجم ہوسکتی ہے۔ دوسری بار ص ۱۱۸ میں قدر بلگرامی نے اسی کتاب کے مآخذ گناتے ہوئے «معیار المعجم» (اوپر ذکر آچکا ہے کہ قدر بلگرامی المعجم کو معیار المعجم کہتے ہیں) کے علاوہ اس کتاب کا نام بھی اپنے مآخذ میں لیا ہے وہاں بھی اس کے مصنف کا نام نہیں لیا ہے اگر «حدائق المعجم» اختصار ہے المعجم کا تو المعجم کو مآخذ کہنے کے بعد «حدائق المعجم» کو مآخذ کہنے کی کیا ضرورت اور کیا موقع؟ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ «حدائق المعجم» کسی اور مصنف کے قلم سے المعجم کی شرح ہے۔ شرح میں چونکہ اصل کے علاوہ بھی مطالب ہوتے ہیں اس لیے اس کو کسی کتاب کے مآخذ میں اصل کے علاوہ شمار کیا جاسکتا ہے؟ تیسری بار ص ۴۴۰ میں صراحۃً قدر بلگرامی نے اسے ابن قیس کی تصنیف کہا ہے چنانچہ لکھتے ہیں «ابن قیس، حدایق المعجم میں کہتا ہے»۔

اب یہ بات سمجھنے کو رہ جاتی ہے کہ «المعجم» سے اس کا کیا تعلق ہے اور «حدائق المعجم» اس کا نام کہاں سے آیا نیز جب «المعجم» سے اس کا تعلق (اختصار وغیرہ کا) ہے اور یہ خود کوئی مستقل تصنیف محمد بن قیس کی نہیں ہے تو مصنفین اسے محمد بن قیس سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔

مسٹر ریو (Rieu) اور ان کی بنا پر قزوینی بھی جیسا اوپر ذکر ہوا اسے «المعجم» کا اختصار سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے متعلق دو خیال ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ اس میں «المعجم» کے تینوں فن موجود ہیں۔ مگر ہر فن مختصر طور پر شواہد یا شواہد و مطالب دونوں میں سے کچھ کچھ حذف کرکے اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ایسا ہوا بھی ہے چنانچہ اس کا ایک اختصار «میزان الاوزان و لسان القلم در شرح الفاظ عجم» (جس کا ذکر آگے آتا ہے) محفوظ ہے۔ دوسرا یہ خیال کہ اصل مطالب و شواہد، میں کمی کرنے کے ساتھ یا کمی کے بغیر کوئی فن بھی حذف کردیا گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے «حدایق المعجم» عروض وقافیہ پر مشتمل ہو اور علم بدیع چھوڑ دیا گیا ہو۔ کیونکہ تھانوی کی کشاف میں اس کا ذکر عروض و قافیہ کے سلسلے میں اور باقی کتابوں میں عروض کے سلسلے میں ہے۔ «فرہنگ جہاں گیری» سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ المعجم کا حصۂ عروض، المعجم سے الگ کرکے ایک مستقل رسالہ کی حیثیت سے بھی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا ہے چنانچہ اس نے لفظ «خورنگاہ» کی سند میں لکھا ہے «محمد بن قیس در عروض خود نوشتہ» اس سے مطلب یہ ہوا کہ در رسالۂ عروض خود یا در کتاب عروض خود نوشتہ۔ اگر عروض کا حصہ «المعجم» سے دستیاب نہیں ہوتا تھا تو صاحب «فرہنگ جہاں گیری» «در عروض خود» نہ لکھتا بلکہ پوری کتاب المعجم، کا نام لیتا۔ اگر کسی کتاب میں عروض کے ساتھ قافیہ بھی شامل ہو تو اہل فن اسے عروض کی کتاب کہنا کافی سمجھتے ہیں اور قافیہ کا ذکر اس میں مضمر مانتے ہیں چنانچہ طوسی کی «معیار الاشعار»

اگرچه عروض وقافیه دونوں پر مشتمل ہے مگر اکثر قدیم کتابوں میں صرف عروض کے نام سے یاد کی جاتی تھی عروض و قافیہ کے علاوہ مباحث بدیع وغیرہ بھی کسی کتاب میں شامل ہوں تو اس کتاب کو صرف عروض کی کتاب یا رسالہ کہنے کی رسم نہیں ہے۔ «المعجم» ایسی ہی کتاب ہے۔ اگر صاحب «فرہنگ جہانگیری» کی مراد المعجم سے ہوتی تو وہ عروض کی کتاب نہیں کہتا ایسی کتاب کو صرف عروض کہنے کا ایک موقع ہے۔ وہ جب ہے کہ عروضی مبحث کے سلسلے میں کتاب کا ذکر کرنا مقصود ہو۔ «خور نگاہ» کی بحث میں یہ صورت نہیں ہے۔ «المعجم» کا اختصار ہونے کی صورت میں خواہ وہ تینوں فنون پر مشتمل ہو خواہ چند فنون پر «حدایق المعجم» کے نام کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ جس شخص نے اسے مختصر کیا اس نے اس اختصار کو اپنی ذاتی کاوش سمجھکر اور اس فرق کی بنا پر جو مختصر ہونے کی وجہ سے اس میں اور المعجم میں پیدا ہوگیا۔ اس کا نام اپنے طور پر المعجم سے مختلف «حدائق المعجم» رکھ دیا۔ جیسے المعجم کے اختصار «میزان الاوزان» کا نام المعجم سے مختلف ہے۔ چونکہ اس مختصر نسخہ میں یہ ذکر ہوگا کہ یہ شمس قیس کی تصنیف کا اختصار ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مختصر کرنے والے کا نام اس پر کسی وجہ سے موجود نہ ہو اس لیے اصل کتاب کے مصنف کا خیال کرکے مصنفین نے اس کا ذکر محمد بن قیس کی تصنیف کی حیثیت سے کیا اور مختصر کرنے والے کا نام اس کے ساتھ نہیں لیا۔ «حدائق المعجم» کو المعجم کا اختصار ماننے کی صورت میں یہ بات تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے کہ محمد بن قیس نے خود اسے المعجم سے مختصر کیا ہو۔ کتاب الکافی سے مختصر کرکے المعجم تالیف کرنے کی وجہ تو اس کے لیے تھی لیکن المعجم کو مزید مختصر کرنے کی اس کے لیے کیا وجہ ہوسکتی تھی۔ پھر اس کی کوئی سند بھی نہیں ہے کہ اس نے المعجم کو مختصر کیا۔

میری رائے میں «حدائق المعجم» کے متعلق اس کے المعجم کا اختصار ہونے کے علاوہ اور صورتیں بھی ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ وہ المعجم ہی ہو

اور «معیار المعجم» کی طرح غلط طور پر «حدائق المعجم» نام پڑگیا۔ آگے چلکر یہ غلط نام نقل در نقل متعدد کتابوں میں گھر کرگیا۔ دوسری صورت یہ کہ «حدائق المعجم» کی دوسرے مصنف کے قلم سے المعجم کی شرح ہو۔ اس کتاب کا خیال کرکے یہ اس سبب سے کہ شارح کا نام معلوم نہ ہوسکا اس کو محمد بن قیس سے منسوب کردیا گیا جب تک «حدائق المعجم» کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو اور اس کا مقابلہ المعجم سے نہ کیا جائے۔ ان تینوں خیالوں میں سے کسی ایک خیال کو بالکل صحیح اور باقی خیالات کو بالکل غلط نہیں کہا جاسکتا۔ «فرہنگ جہانگیری» سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصنف نے فارسی کا ایک لغت بھی لکھا تھا چنانچہ «فرہنگ جہانگیری» کے دیباچہ میں اس کے مؤلف نے اپنے مآخذ میں «فرہنگ محمد بن قیس» کا بھی نام لیا ہے۔ مصنف کا یہ لغت اب ناپید ہے۔

امیر خسرو دہلوی۔

ہندوستان کے مشہور فارسی گو شاعر جن کے کمال شاعری اور اُستادی کے ایرانی بھی معترف ہیں۔ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ شاعری میں کثیر التصانیف ہیں۔ امیر خسرو نے اعجاز خسروی ۳ جلدوں میں لکھی۔ یہ ۷۱۹ ھ میں تمام ہوئی اس کتاب میں علم بدیع پر بہت زور طبع صرف کیا ہے۔ سینکڑوں صنعتیں اپنی طرف سے ایجاد کی ہیں۔ نہایت ضخیم کتاب ہے۔ اس میں فن کی سنجیدگی کم ہے، تفنن طبع اور فضول باتیں بہت ہیں۔ پروفیسر اصغر علی روحی صاحب «دبیر عجم» نے اس پر بجا طور پر یہ تنقید کی ہے «حضرت امیر خسرو دہلوی در فن سیاقت و بدیع برطبق مذاق ابناء آں روزگار کتابے موسوم بہ اعجاز خسروی تالیف نمودند و آں کتاب ست کہ باہمہ اطناب و اطالت نظر بہ ضرورت فن بلاغت ہیچ با خود ندارد»۔

عاشق صادق:

یہ ایک مجہول الحال ہندوستانی مصنف ہے۔ امیر خسرو کا معاصر تھا۔ اس کی تصنیف کا نام «جامع الصنائع» ہے جو عروض اور بدیع دونوں پر مشتمل ہے۔ «حدایق البلاغت» نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ

یہ ھیں۔ «یکے از معاصران امیر خسرو دھلوی کہ عاشق صادق نام داشت رسالہ عروض و صنائع تالیف نمود و آں را جامع الصنائع نام کردہ و در آنجا سہ بحر دیگر اختراع نمودہ و باعتقاد خود دو رکن تازہ پیدا ساختہ»۔ اس کے متصلاً بعد اور ایک سطر اس پر اور صرف کی ھے۔ جس میں اس کی اس عروضی ایجاد کا تحصیل حاصل ھونا ظاھر کیا ھے۔ اس کے سوا اور کسی کتاب میں اس مصنف یا اسکی تصنیف کا ذکر نہیں ملا۔

اس کی اس عروضی ایجاد سے قیاس ھوتا ھے کہ اس نے علم بدیع میں بھی اسی طرح کچھ نئے گل کھلائے ھوں گے۔ لفظ صادق معلوم نہیں اس مصنف کے نام کا جزو ھے یا صاحب «حدائق البلاغت» نے عاشق کی رعایت سے مزاحاً اضافہ کردیا۔ ممکن ھے اس رعایت سے خود مصنف نے یہ لفظ بطور تخلص اختیار کیا ھو۔

حسن:

اس مصنف کا نام اور تخلص دونوں حسن ھے اس نے علم بدیع پر ایک کتاب «بحر الصنائع» لکھی۔ یہ کتاب معلوم ھے ۷۳۱ ھ میں تصنیف ھوئی۔ اس میں صنعتوں کی تعریف اور مثالیں دونوں نظم میں ھیں۔ مصنف نے مثال میں اکثر شاعروں یہاں تک کہ سعدی اور سلمان ساوجی کے اشعار بھی نقل کیے ھیں جو اس کی تصنیف کے وقت ۲۲ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔

اس کتاب کی نظم سست اور اکثر بےمزہ اور رکیک ھے۔ اس کی ابتدا میں مصنف نے اپنی نسبت بڑے بڑے دعوے کیے ھیں۔ اس نے لکھا ھے کہ اس کتاب کی تصنیف کے لیے اس نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ وہ اس کا بھی مدعی ھے کہ اس نے اس میں جدت طبع سے کام لیا ھے۔ رشید وطواط اور اس کی کتاب «حدائق السحر» کا ذکر کر کے وطواط پر اپنی فضیلت علمی ظاھر کی ھے۔ چنانچہ لکھتا ھے:

شبی در خلوتی بودم مفکر　　زبان فکر در معنی مذکر
نگہ کردم بانواع تألیف　　نظر کردم باصناف تصانیف
ھمی چیدم گل از باغ قدیمان　　ھمی جستم نواہ عندلیبان

* در آں حالت زستان رشیدی   شنیدم بانگ مرغ من بریدی
که در عالم حدائق سحر باشد   چو شعری بر عروساں بر باشد
نهادم دست دل را بر حدائق   نظر بردم بداں باغ دقائق
بهر شاحی هزاراں دست دیدم   ز هر مرغی هزار آوا شنیدم

در آں ساعت خرد گفتا حسن خیز   براق خود در ایں میدان بر انگیز
مخواه از هیچ خانه شربت آب   منوش از کاسهٔ کس بادهٔ ناب
سار از ذهن خود چیزی درآں فن   که بادت آفریں بر ذهن روشن
حدودش را بطور مثنوی آر   همه الفاظ نغز و معنوی آر
مثالها گویه امثالش سراسر   که باتو می نباشد کس برابر
اگرچه بد درین فن چست وطواط   چنانک اندر علوم بعض بقراط
ولی وطواط مرغی بس حقیرست   چوک همچو تو ساری اسیرست
مگو کیں دعوئ من بس عظیم ست   که فوق کل ذی علم علیم ست
به نام خوشش سحر الصنائع   ادیباں را بده گنج بدائع

شرف الدین حسن بن محمد رامی تبریزی:

علم بدیع پر اس مصنف کی تصنیف کا نام «حدائق الحدائق» ہے۔ یہ مصنف بہادر خاں امیر شیخ اویس ایلکانی (٧٥٧ - ٧٧٦ ھ) کا ملازم تھا۔ اسی کے حکم سے یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب رشید وطواط کی «حدائق السحر» کی شرح ہے۔ اس مصنف نے مثال میں وہ فارسی اشعار استعمال کیے ہیں جو اس زمانہ میں متداول تھے۔

تاج الحلاوی:

اس مصنف کا نام علی بن محمد ہے۔ تاج الحلاوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے شعرا میں ہے۔ علم بدیع پر اس کی کتاب کا نام «دقائق الشعر» ہے۔ اس میں علم بدیع کے علاوہ چند فصلیں اصناف شعر، عیوب قوافی اور عیوب ردیف پر بھی ہیں۔ اس نے کتاب کے مقدمہ میں «حدائق السحر» کا ذکر کیا ہے۔ مثال میں اکثر اشعار «حدائق السحر» سے مختلف پیش کیے ہیں۔

[٢/٤/١٩٦٤م]

* * *

قاسم بن قطلوبُغا الحنفی

فضل الرحمن*

تصانیف :

قاسم کی تصنیفی زندگی کی ابتدا اٹھارہ سال کی عمر سے ہوئی۔ سب سے پہلی کتاب جو ۸۲۰ھ میں ان کے قلم سے نکلی مرائض کے فن پر تھی اور اس کا نام «جامعة الأصول فی الفرائض» تھا۔ ۵۹ سال کے طویل عرصے میں اپنی عمر کے آخر حصے تک قاسم نے بہت کچھ لکھا۔ انہوں نے اپنے دور کے مروجہ علوم و فنون میں سے ہر ایک پر لکھا ہے اور ان کے تصنیفی اور تالیفی کام میں اس زمانے کی علمی دنیا کے سارے رجحانات مل جاتے ہیں۔ ان کے یہاں شروح، حواشی، تخریجات، ترتیب و تبویب، تلخیصات، اور مفرد مسائل پر مستقل تصانیف، غرض سبھی کچھ ملتا ہے۔ چھوٹی بڑی سب کتابیں شمار کی جائیں تو تعداد سو سے اوپر نکلتی ہے۔ تصانیف کی اس کثرت کے باوجود ان کی طباعت کی طرف توجہ کم کی گئی۔ صرف تین کتابیں ایسی ہیں جو اب تک طبع ہوئی ہیں۔ «تاج التراجم فی من صنف من الحنفیة» لیپزگ میں ۱۸۶۲ء[1] میں، «منیة الألمعی فی ما فات من تخریج الهدایة للزیلعی» مصر میں ۱۳۶۹ھ میں، اور «رد القول الخائب فی القضاء علی الغائب» ہندستان میں، طبع ہوئیں۔ آخرالذکر رسالہ مختلف رسائل کے ایک مجموعے «مجموعة الرسائل» (ص ۲۵ تا ص ۲۸) مطبع حیدری بمبئی میں چھپا ہے۔ سال طباعت مندرج نہیں ہے۔ جن نسخوں سے اس کی تصحیح وغیرہ میں مدد لی گئی ہے اُن کا بھی ذکر

(*) فضل الرحمن، لیکچرر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱) یہ کتاب ابھی حال میں دوبارہ شائع ہوئی ہے۔

نہیں ملتا تاہم صحت متن کا خاصا خیال رکھا گیا ہے ۔ عام طور سے لوگ قاسم سے ان کی مشہور تصنیف «تاج التراجم» سے واقف ہیں جو سوانح کے معتبر مآخذ میں شمار کی جاتی ہے ۔ قاسم کی بقیہ تصانیف اگرچہ طباعت سے محروم رہیں لیکن انہیں ہمیشہ اہمیت دی گئی فقہ کی معتبر کتابوں میں قاسم کی تصانیف کے حوالے بطور سند کے پیش کیے جاتے ہیں ۔ «در مختار»[1] اور اس کی شرح «رد المحتار»[2] میں جو فقہ حنفی کے معتبر اور مستند ترین ماخذوں میں سے ہیں جا بجا قاسم کی تحقیقات کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ ابن عابدین شامی مؤلف «ردالمحتار» نے دیباچے میں اُن کتابوں اور مصنفوں کا ذکر کرتے ہوئے جن پر تحقیق مسائل میں بھروسا کیا ہے لکھا ہے «معتمداً فی ذلک علی ما حرّره الأئمة الأعلام من المتأخرین العظام کالإمام ابن الهمام و تلمیذه العلامة قاسم و ابن امیر حاج»[3] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متأخرین علمائے حنفیہ میں قاسم کی حیثیت فقہ کے ایک بڑے امام کی ہے ۔ ذیل میں فن وار تفصیلی فہرست قاسم کی تصانیف کی پیش کی جاتی ہے[4] :

عربی زبان و ادب :

۱ــتعلیقة علی القصاری فی الصرف[5] : علم صرف میں علاء الدین احمد الجمدی البرهانی کا تصنیف کیا ہوا متن «القصاری» کے نام سے مشہور ہے ، اس پر قاسم نے تعلیقات لکھی ہیں۔

۲ــحاشیة علی شرح العزی فی الصرف للتفتازانی[6] : عزالدین ابوالفضائل

(۱) مثلاً دیکھیے در مختار (طبع علی حاشیة رد المحتار) ۱: ۵۳، ۱۳۲ وغیرہ .

(۲) ردالمحتار ۱ : ۵۱ .

(۳) ایضاً ۱ : ۳ .

(٤) کتابوں کے ناموں کے مآخذ کی تصریح حواشی میں کردی گئی ہے تفصیلات ہماری فراہم کی ہوئی ہیں .

(۵) الضوء اللامع ٦ : ۱۸۷ .

(٦) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف الظنون : ۱۱٤۰ .

ابراهیم بن عبدالوهاب بن عمادالدین بن ابراهیم الزنجانی (م بعد ٦٥٥ ھ) نے ایک مختصر سی کتاب علم صرف میں لکھی جس کا نام « العزی فی الصرف» [یا التصریف] ھے ۔ سعدالدین‌مسعود بن عمر التفتازانی (م ۷۹۱ ھ) نے اس کی شرح کی اور اصل کتاب پر اپنی طرف سے اضافے بھی کیے جس سے اس کی حیثیت ایک مستقل کتاب کی ہوگئی ۔ یہ تفتازانی کی سب سے پہلی تالیف ھے اور ۷۳۸ ھ مکمل ہوئی ۔ قاسم نے اسی شرح پر حاشیہ لکھا ھے ۔

۳ــتعلیقة علی الأندلسیة فی العروض[1] . ابو محمد عبدالله بن محمد الانصاری الاندلسی المعروف بابی الجیش الانصاری المغربی (م ٥٤٩ ھ) کا قصیدہ فن عروض میں « عروض الاندلسی» اور « الاندلسیة فی العروض» کے نام سے مشہور ھے اور علل الاعاریض سے خاص طور سے بحث کرتا ھے ۔ قاسم نے اس قصیدے کی شرح کی ھے ۔

٤ــشرح خمسة العز عبدالعزیز الدیربی فی العربیة[2] .

٥ــاختصار تلخیص المفتاح[3]: «مفتاح العلوم» سکاکی (م ٦٢٦ ھ) کی تالیف ھے ۔ کتاب تین قسموں پر تقسیم کی گئی ھے ۔ قسم اول صرف میں ، قسم ثانی نحو میں ، قسم ثالث معانی و بیان میں ھے ۔ قسم ثالث کی تلخیص شمس الدین محمد بن عبد الرحمن بن عمر القزوینی معروف بہ خطیب دمشق (م ۷۳۹ ھ) نے « تلخیص المفتاح » کے نام سے کی ۔ قاسم نے اس تلخیص کو مختصر کیا ھے ۔

عقائد :

٦ــحاشية علی شرح العقائد[4]: تفتازانی کی «شرح عقائد نسفی» پر حاشیہ ھے ۔

۷ــالفاظ الردة[5]: جن اقوال کی بنا پر کسی کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاےگا اس رسالے میں ان کا ذکر ھے ۔

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف : ۱۱۳۵ .

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٤) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٥) بروکلمن ، تکمله ۲ : ۹۳

۸ــقواعد فی نظم العقائد[1].

۹ــحاشیۃ علی المسایرۃ[2] : ابن ھمام کی «المسایرۃ فی العقائد للتجیۃ فی الآخرۃ» پر حاشیہ ھے.

۱۰ــمن یکفر و لم یشعر[3] : کفریہ اقوال و افعال کے بارے میں ایک رسالہ.

منطق وغیرہ :

۱۱ــشرح منار النظر فی المنطق لابن سینا : سخاوی نے اس کتاب کا یوں نام دیا ھے[4] مگر «کشف الظنون» میں «میزان النظر فی المنطق» (مصنف نا معلوم) کے نام کے تحت بتایا ھے کہ قاسم نے اس کی ممزوج شرح لکھی ھے جس کا نام «تقویم المیزان» ھے مگر پھر لکھا ھے کہ یہ غالباً وھی «تقویم اللسان» ھے جس کا ذکر پہلے گزرا[5]. یہ عجیب بات ھے کیونکہ «تقویم اللسان» تو فن رجال میں ھے اور یہ کتاب فن منطق میں.

۱۲ــشرح قصیدۃ الغزلیۃ[6].

۱۳ــالجواب[7] : بروکلمن نے عنوان اتنا ھی دیا ھے جس کی وجہ سے معلوم نہیں ھوتا کہ کس کا جواب ھے.

۱٤ــشرح المقتبس[8].

علوم القرآن :

۱۵ــتعلیقات علی البیضاوی[9] : تفسیر سے متعلق قاسم کی اسی ایک تالیف

---

(۱) بروکلمن ، تکملہ ۲ : ۹۳

(۲) بروکلمن ، تکملہ ۲ : ۹۳ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱

(۳) اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ (٤) الضوء ٦ : ۱۸۷

(۵) کشف : ۱۹۱۹.

(٦) بروکلمن ، تکملہ ۲ : ۹۳.

(۷) بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹) [بریکٹ کے اندر کے اعداد بروکلمن کی کتاب کے نئے ایڈیشن کے ھیں].

(۸) بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹). (۹) کشف : ۱۹۳.

کا پتہ چلتا ہے . یہ کتاب پوری نہ ہوئی صرف سورۃ بقرہ کے دوسرے رکوع کی آیت «فہم لا یرجعون» تک تعلیقات لکھی جاسکیں.

۱۶ــغریب القرآن[1] : قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح و توضیح.

علوم الحدیث :

۱۷ــشرح منظومة فی الحدیث لابن الجوزی[2] : یہ ابن جوزی کی نظم کی صرف شرح ہی نہیں بلکہ قاسم کا کہنا ہے کہ اس شرح میں انہوں نے سارے علوم و فنون پر بحث کی ہے . چنانچہ اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف اور دائرة المعارف کی سی تھی. قاسم کو اپنی اس کتاب پر بہت ناز تھا اور کہتے تھے «انہ زردخانتی» اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اپنا سارا علمی سرمایہ اس میں جمع کردیا ہے . اس کتاب کی صرف دو جلدیں تیار ہوسکیں کتاب مکمل نہ ہوئی.

۱۸ــشرح قصیدة ابن الفرح الاشبیلی فی الاصطلاح[3] : شہاب الدین ابو العباس احمد بن الفرح اللخمی المالکی (م ۶۹۹ ھ) نے اصول حدیث کو ایک نظم کی شکل دے دی تھی تاکہ حفظ میں آسانی ہو . قاسم نے اس کی شرح کی اور اس میں اپنے استاد عز بن جماعة پر متعدد مقامات پر گرفت کی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حنفیہ کے اصول حدیث پر سخت اعتراضات کرتے تھے .

۱۹ــحاشیة علی شرح ألفیة العراقی[4] : مشہور محدث زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی نے ابن الصلاح (م ۸۰۶ ھ) کی کتاب «علوم الحدیث» کی

---

(۱) زرکلی : الأعلام ۶ : ۱۵ . الأعلام سے پتا چلتا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ موجود ہے .

(۲) کشف الظنون : ۱۸۶۶ اور اسماء المؤلفین (۱ : ۸۳۱) نے یہی نام دیا ہے مگر الضوء اللامع (۶ : ۱۸۶) میں اس کا نام «شرح منظومة ابن الجزری» دیا ہوا ہے . شذرات (۷ : ۳۲۶) میں بھی ابن الجزری ہے . اس میں منظومة کا نام «الہدایة» بتایا گیا ہے .

(۳) الضوء ۶ : ۱۸۶ ; کشف : ۱۳۲۹ .

(۴) الضوء ۶ : ۱۸۶ کشف : ۱۵۶ .

تلخیص کر کے اس کا نام «الألفیة فی اصول الحدیث» رکھا۔ پھر الفیہ کی شرح «فتح المغیث» کے نام سے لکھی۔ قاسم نے اس شرح پر حواشی لکھے ہیں۔

۲۰ و ۲۱—حاشیة نخبة الفکر و شرح نخبة[1]: «نخبة الفکر فی مصطلح اهل الأثر» اصول حدیث میں ابن عسقلانی کا مشہور متن ہے۔ قاسم نے اس متن پر بھی حاشیہ لکھا[2] ہے اور شرح بھی[3]۔

۲۲—تخریج عوارف المعارف[4]۔ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی (م ۶۳۲ ھ) سلسلۂ سہروردیہ کے بانی اور محققین صوفیہ میں سے ہیں۔ ان کی کتاب «عوارف المعارف» علم طور سے مشائخ صوفیہ میں متداول و مقبول ہے۔ اس میں جو احادیث آئی ہیں قاسم نے ان کی تخریج کی ہے۔

۲۳—تخریج احادیث الإختیار شرح المختار[5]: ابو الفضل مجد الدین عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی (م ۶۸۳ھ) نے «المختار فی فروع الحنفیة» کے نام سے امام ابوحنیفہ کے اقوال اور حنفی مذهب کے مستند مسائل جو امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے منقول ہیں جمع کیے۔ خود اس کی شرح بھی لکھی جس کا نام «الإختیار» ہے۔ شرح میں علل المسائل، معانی اور فروع کا ذکر بھی کیا۔ «المختار» کا شمار ان متون اربعہ (المختار، الکنز، الوقایة، مجمع البحرین)۔ میں ہے جن پر متاخرین حنفیہ اعتماد کرتے ہیں۔ قاسم نے «الإختیار» کی احادیث کی تخریج کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں مرتب ہوئی۔

۲۴—تخریج احادیث بزدوی فی اصول الفقہ[6]: فخر الاسلام علی بن محمد

---

(۱) الضوء ۶ : ۱۸۶۔ (۲) کشف : ۱۹۳۷۔

(۳) اسماء المؤلفین (۱ : ۸۳۰) سے اس کا نام «تعلیقة علی شرح نخبة الفکر لتقی الدین الشمنی» معلوم ہوتا ہے۔

(٤) الضوء ٦ : ١٨٦ ۔

(٥) کشف : ۱٦٢٣؛ الضوء ٦ : ١٨٦؛ شذرات الذهب ٧ : ٣٢٦.

(٦) کشف : ١١٣ ؛ الضوء ٦ : ١٨٦ ؛ اسماء المؤلفین (١ : ٨٣١) : «تخریج الأحادیث من اصول البزدوی» ؛ شذرات ٧ : ٣٢٦

اپزدوی م ۴۸۲ھ اکابر حنفیہ میں سے ہیں۔ ان کی «اصول الفقہ» حنفی اصول فقہ کی بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ قاسم نے اس کی احادیث کی تخریج کی۔ یہ مختصر سی کتاب تھی۔

۲۵—تخریج احادیث تفسیر ابی اللیث[1]: ابو اللیث نصر بن محمد الفقیہ السمرقندی الحنفی (م ۳۸۵ھ) مشہور و معروف حنفی فقیہ کی تصانیف فقہ کے علاوہ دیگر فنون میں بھی ہیں۔ قاسم نے ان کی تفسیر کی احادیث کی تخریج کی۔

۲۶ تا ۲۹—تخریج احادیث الأربعین فی اصول الدین؛ و منهاج العارفین؛ و جواهر القرآن؛ و بدایة الهدایة[2]: یہ چاروں کتابیں امام غزالی کی ہیں۔ ان کی احادیث کی تخریج قاسم نے کی ہے۔

۳۰—تخریج الأحیاء بما فات من تخریج احادیث الإحیاء[3]: امام غزالی کی «إحیاء العلوم» کی احادیث کی تخریج عراقی نے «المغنی عن حمل الاسفار» کے نام سے کی تھی۔ جن احادیث کی تخریج عراقی سے چھوٹ گئی ان کی قاسم نے کردی۔

۳۱—تخریج احادیث الشفاء[4]: ابو الفضل عیاض بن موسی القاضی الیحصبی (م ۵۴۴ھ) نے «الشفاء بتعریف حقوق المصطفی» کے نام سے سیرت کی مشہور کتاب لکھی ہے۔ قاسم نے اس کی احادیث کی تخریج شروع کی تھی مگر کتاب نامکمل رہی اور کام چند اوراق سے آگے نہ بڑھ سکا۔

۳۲— منیة الألمعی بما فات الزیلعی[5]: حنفی محدث ابو محمد جمال الدین

---

(۱) الضوء ۶ : ۱۸۶؛ کشف : ۴۴۱

(۲) الضوء ۶ : ۱۸۶

(۳) الضوء ۶ : ۱۸۶؛ کشف : ۲۴ میں اس کا نام «تحفة الأحیاء» دیا ہے اور اسماء المؤلفین میں ایک جگہ «اتحاف الأحیاء» بتایا ہے اور دوسری جگہ «تحفة الأحیاء» (۱ : ۸۳۰).

(۴) الضوء ۶ : ۱۸۶

(۵) الضوء ۶ : ۱۸۶

عبداللہ بن یوسف بن محمد الزیلعی (م ۷۶۲ ھ) نے «ھدایہ» کی احادیث کی تخریج «نصب الرایۃ فی احادیث الھدایۃ» کے نام سے کی۔ قاسم نے اپنی کتاب میں ان احادیث کی تخریج کی جو زیلعی سے رہ گئی تھیں یہ کتاب مصر میں «منیۃ الألمعی فی ما فات من تخریج احادیث الھدایۃ للزیلعی[1]» کے نام سے ۱۳۶۹ ھ میں چھپ گئی۔ قاسم نے اس کے دیباچے میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے غفلت کے نتیجے میں حنفی علماء اور خاص کر صاحب ہدایہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ غریب احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ قاسم نے بتایا کہ متقدمین فقہاے حنفیہ احادیث کا املا اپنی اسانید سے کراتے تھے۔ امام ابو یوسف، محمد، طحاوی، خصاف، ابو بکر رازی اور کرخی وغیرہ سب نے یہی کیا ہے۔ بعد کے حنفی فقہا نے ان حضرات پر اعتماد کی بنا پر ان احادیث کو بغیر سند اور حوالے کے اپنی کتابوں میں درج کیا جیسے صحاح ستہ پر اعتماد کرکے ان کی احادیث بلا سند اور اکثر بلا حوالے درج کی جاتی رہی ہیں۔ جن لوگوں کو مذکورہ احادیث کی اسناد کا علم نہ تھا انہوں نے ان حنفی فقہاء پر مذکورہ الزام لگا دیا۔ قاسم کے خیال کی تائید امام محمد کی «کتاب الآثار» کے مطالعے سے بھی ہوتی ہے۔

۲۳—بغیۃ الرائد فی تخریج احادیث شرح العقائد[2]: نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد النسفی (م ۵۳۷ ھ) نے «العقائد» کے نام سے اصول دین کا ایک مختصر متن تیار کیا تھا۔ اس کی مشہور ترین شرح سعد الدین مسعود بن عمر التفازانی (م ۷۹۱ ھ) نے لکھی جو «شرح عقائد نسفی» کے نام سے متداول ہے۔ قاسم نے اسی شرح کی احادیث کی تخریج کی ہے۔

۲۴—نزھۃ الرائض فی ادلۃ الفرائض[3]: سراج الدین محمد بن محمود بن عبدالرشید

---

(۱) کشف: ۱۷۸۵ اور اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۱ میں یہی نام دیا گیا ہے۔
(۲) الضوء ٦: ١٨٦؛ اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۰ میں نام «بغیۃ الراشد» ہے
(۳) الضوء ٦: ١٨٦؛ اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۰ شذرات ۷: ۳۲٦ کشف: ۱۲۵۰: «تخریج احادیث الفرائض».

السجاوندی الحنفی کی کتاب فرائض میں « السراجیة » کے نام سے مقبول درسی کتاب ہے قاسم نے « نزھة الرائض » کے نام سے اس کی احادیث کی تخریج کی۔

۳۵ـــترتیب مسند ابی حنیفة لابن المقری[1] : ابوبکر محمد بن ابراہیم بن علی الخازن مشہور بہ ابن المقری الاصفہانی (م ۳۸۱ ھ) اکابر حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ ذہبی «تذکرة الحفاظ» میں انہیں «ابن المقری محدث اصبہان الامام الرحال الحافظ الثقة» اور ابونعیم اصفہانی نے «محدث کبیر صاحب مسانید، «سمع ما لا یحصی کثرة» کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی حدیثی روایات کو جمع کیا اور اس کا نام «مسند ابی حنیفة» رکھا۔ ابن حجر نے بتایا ہے کہ یہ مسند صرف امام ابوحنیفہ کی مرفوع روایات پر مشتمل ہے۔ قاسم نے اس کی احادیث کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے۔

۳۶ـــترتیب مسند ابی حنیفة للحارثی[2] : ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری (م ۳۴۰ ھ) مشاہیر ائمۂ احناف میں سے ہیں۔ شاہ ولیؒ اللہ نے «الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ» میں ان کو اصحاب الوجوہ میں سے بتایا ہے جن کا درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد مطلق منتسب کے درمیان ہے۔ دو واسطے سے امام محمد کے شاگرد ہیں۔ فن حدیث میں ان کا پایہ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کے بارے میں حافظ خلیلی نے « یعرف بالاستاذ له معرفة بهذا الشأن » سمعانی نے «کان شیخاً مکثراً من الحدیث» اور ذہبی نے «تذکرة الحفاظ» میں «عالم ماوراء النهر و محدثه الامام العلامة . . . الملقب بالاستاذ» کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابن حجر نے «تعجیل المنفعة» میں انہیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے بھی امام ابو حنیفہ کی مسند تیار کی، جو ابن المقری کی مسند سے بڑی تھی۔ قاسم نے اس مسند کی احادیث کو فقہی ابواب پر مبوب ومرتب کیا۔

---

(۱) الضوء ٦ : ١٨٦ .

(۲) الضوء ٦ : ١٨٦؛ کشف : ١٦٨٠ .

٣٧ــاملی علی مسند ابی حنیفة[1] : حارثی کی مسند پر قاسم نے دو جلدوں میں اپنے لکھر سپرد قلم کرائے تھے .

٣٨ــاملی علی مسند عقبة بن العامر الجهنی نزیل مصر[2] : حضرت عقبة بن عامر الجہنی مشہور صحابی ہیں. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کثیر تعداد میں حدیثیں روایت کیں . صحابہ اور تابعین دونوں نے ان سے روایت کی ہے . اہل مصر نے بھی ان سے بکثرت روایت کی. قاری، فقہ و فرائض کے عالم، شاعر اور کاتب تھے آپ نے قرآن بھی جمع کیا تھا اور آپ کا مصحف حضرت عثمان کے مصحف کی ترتیب سے مختلف تھا. اس مصحف کے اخیر میں آپ نے اپنے دستخط بھی ثبت فرمائے تھے . مصر کے گورنر رہے اور حضرت معاویہ کے عہد حکومت کے شروع میں ٥٨ ھ میں وفات پائی[3] . ان کی سب روایتوں کو جمع کرکے مسند ترتیب دے دی گئی تھی. اس مسند پر قاسم نے امالی لکھے .

٣٩ــعوالی احادیث لیث[4]: لیث بن سعد بن عبد الرحمن الفهمی (م ١٧٥ھ) مصر کے مشہور فقیہ اور امام مالک کے معاصر ہیں. ان کی احادیث کی عالی سندیں قاسم نے جمع کیں.

٤٠ــعوالی احادیث طحاوی[5]: امام طحاوی (م ٣٢١ ھ) اکابر حنفیہ میں سے ہیں. حدیث و آثار کے زبردست عالم اور فقہ الحدیث کے ماہر ہیں . ان کی احادیث کی بھی عالی سندیں قاسم نے جمع کیں.

٤١ــتعلیق مسند الفردوس[6]: ابو شجاع شیرویہ بن شہردار ابن شیرویہ

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٦؛ کشف : ١٦٨٠.

(٢) الضوء ٦ : ١٨٦؛ بروکلمن نے اس کتاب کا نام « مسند سیدی عقبة بن عامر الجهنی» دیا ہے (٢ : ٨١) جس سے خیال ہوتا ہے قاسم نے خود ہی یہ مسند مرتب کیا ہے.

(٣) ابن حجر : الإصابة ٢ : ١١٦٤.

(٤) الضوء ٦ : ١٨٦ ؛ کشف : ١١٧٨؛ بروکلمن ٢ : ٨١ (٩٩).

(٥) الضوء ٦ : ١٨٦؛ بروکلمن ٢ : ٨١ (٩٩) (٦) الضوء ٦ : ١٨٦.

بن فنا خسرو الهمدانی الدیلمی (م ۵۰۹ ھ) نے «فردوس الأخبار بمأثور الخطاب المخرج علی کتاب الشهاب» کے نام سے دس ہزار احادیث پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔ اس میں صرف رواۃ کے نام دے کر اسناد کے باقی حصے کو چھوڑ دیا اور ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی۔ ان کے بیٹے حافظ شہردار (م ۵۵۸ ھ) نے «فردوس» کی اسانید چار جلدوں میں جمع کیں اور کتاب کا اختصار بھی کردیا نام «مسند الفردوس» رکھا۔ قاسم نے اس پر تعلیقات لکھی ہیں اور تھوڑے سے حصے کی تخریج بھی کی ہے۔

۴۲—الاجوبة عن اعتراضات ابن ابی شیبة علیٰ ابی حنیفة[1]: ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبة ابراهیم بن عثمان العبسی مولاهم الکوفی (م ۲۲۵ ھ) نامور محدث ہیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجه کے استاد ہیں۔ ان کی تصانیف میں «مسند» اور «مصنف» زیادہ مشہور ہیں۔ «مصنف» واقعتاً ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ ابن حزم نے اس کو «مؤطا مالک» پر فوقیت دی ہے۔ «مصنف» میں صرف احادیث احکام ہیں مگر ابن ابی شیبہ نے اس میں اہل حجاز و عراق کی ساری روایات جمع کردی ہیں۔ چنانچہ احادیث احکام پر متقدمین کی تصانیف میں یہ جامع ترین کتاب ہے۔ احادیث نبوی کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی اس میں جمع کردیے ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے اس کتاب میں ایک مستقل باب امام ابو حنیفہ کے رد میں «هذا ما خالف به ابو حنیفة الاثر الذی جاء عن رسول الله صلی الله علیه وسلم» کے عنوان سے دے کر ایک سو پچیس مسائل کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے اقوال ان کے بارے میں مروی صحیح احادیث و آثار کے مخالف ہیں۔ حنفیہ میں سے ابن ابی شیبہ کے اعتراضات کا باقاعدہ جواب سب سے پہلے حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ ھ) صاحب «الجواهر المضیئة» نے

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷، کشف : ۱۲؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰؛ ذیل تذکرہ الحفاظ : ۱۵۸ ت، میں اس کا نام «الاجوبة المنیفة عن اعتراضات ابن ابی شیبة علی ابی حنیفة» دیا ہوا ہے۔

«الدرر المنيفة فی الرد علی ابن ابی شیبة فیما اورده علی ابی حنیفة» کے نام سے لکھا. ابن ابی شیبہ کے ان اعتراضات کا دوسرا جواب قاسم نے لکھا[1].

٤٣—تبصرة الناقد فی کید الحاسد فی الدفع عن ابی حنیفة[2]: امام ابوحنیفہ پر جو اعتراضات احادیث و روایات کی مخالفت کے بارے میں کیے جاتے ہیں ان پر تنقید کی گئی ہے.

٤٤—ترصیع الجوهر النقی[3]: امام بیہقی مشہور محدث ہیں اور شافعی مسلک کے بہت بڑے حامی اور وکیل. اپنی «سنن» میں جابجا حنفیہ کے مذہب کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے. علامہ علاءالدین علی بن عثمان مشہور بہ ابن الماردینی الترکمانی (م ٧٤٩ ھ) نے اپنی کتاب «الجوهر النقی» میں بیہقی کی «سنن» پر تنقید کی ہے اور علل احادیث کو واضح کیا ہے. قاسم نے ترکمانی کی کتاب کی تلخیص کی اور حروف تہجی کے مطابق اسے ترتیب دیا. یہ کام پورا نہ ہوسکا صرف تیمم کے باب تک ہو پایا.

٤٥—شرح المصابیح للبغوی[4]: محی السنة حسین بن مسعود الفراء البغوی (م ٥١٦ ھ) کی کتاب «المصابیح» (جس کی بنیاد پر مشہور کتاب «مشکوة المصابیح» تیار ہوئی) کی شرح قاسم نے بھی کی.

٤٦—ترتیب اسئلة الحاکم للدار قطنی[5]: قاسم نے علی بن عمر دار قطنی (م٣٨٥ ھ) کی تصانیف کو مرتب کیا ہے.

---

(١) ان اعتراضات کا تیسرا جواب علامہ زاهد الکوثری (م١٣٧١ ھ) نے «النکت الطریفة فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبة علی ابی حنیفة» کے نام سے لکھا.

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ کشف : ٣٣٨ اور اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠ میں اس کا نام صرف «تبصرة الناقد فی کید الحاسد» دیا ہے.

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧؛ کشف : ١٠٠٧ میں اس کا نام «ترجیع الجوهر النقی» اور اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠ میں «ترصیع الجوهر النقی فی تلخیص سنن البیهقی» دیا ہوا ہے.

(٤) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ کشف : ١٦٩٨ ؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١ .

(٥) کشف : ٩١ ؛ الضوء ٦ : ١٨٧ .

۴۷—تخریج احادیث شرح القدوری[1]: احمد بن محمد المعروف بابی نصر الاقطع (م۴۷۴ ھ) کی شرح قدوری میں پیش کردہ احادیث کی تخریج ہے۔

۴۸—حاشیة علی مشارق الأنوار[2]: «مشارق الأنوار» مشہور محدث اور لغوی حسن صغانی (م ۶۵۰ ھ) کی تالیف ہے جس میں صرف صحیح حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ قاسم نے اس پر حاشیہ لکھا۔

۴۹—مختصر المنتقی لابی محمد عبداللہ بن علی الجارود النیسابوری (م ۳۰۷ھ)[3]: ابن جارود صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے اور کیونکہ اس میں صرف احادیث احکام لی گئی ہیں اس لیے اس کا نام «المنتقی» رکھا گیا۔ قاسم نے اس کا اختصار کیا ہے۔

۵۰—ترتیب التمییز للجوزقانی[4]: «التمییز» ضعیف و موضوع حدیثوں سے بحث کرتی ہے۔ قاسم نے اسے مرتب کردیا ہے۔

۵۱—مختصر الأربعین لابی سعید احمد بن محمد المالینی (م ۴۰۹ ھ)[5]: المالینی کی روایت کردہ چالیس حدیثوں کا مختصر مجموعہ۔

---

(۱) شذرات ۷ ۳۲۶، کشف: ۱۶۳۴ سے معلوم ہے کہ غریب احادیث کی شرح ہے

(۲) اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۰؛ کشف: ۱۶۹۰۔

(۳) بروکلمن ۲: ۸۱ (۹۹)، تکملہ ۲: ۹۳۔

(۴) الضوء ۶: ۱۸۶ میں مصنف کا نام «الجوزقانی» دیا ہوا ہے۔ مگر صحیح نام غالباً احمد بن اسحاق الجوزجانی ہے جو ایک واسطے سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور جن کی ایک کتاب «الفرق و التمییز» ہے (الفوائد البہیة: ۱۴)۔ کیونکہ الجوزقانی (اللآلی المصنوعة، معجم البلدان، اسماء المؤلفین: الجوزقانی؛ الأعلام: الجورقانی؛ الرسالة المستطرفة: الجوزقی) کا نام ابو عبداللہ الحسین بن ابراہیم بن جعفر ہے ان کی کوئی تصنیف «التمییز» کے نام سے نہیں ہے۔ موضوعات پر جوزقانی کی جو کتاب ہے اس کا نام مذکورہ مآخذ میں «کتاب الموضوعات من الاحادیث المرفوعات» بتایا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب «کتاب الاباطیل» کے نام سے بھی مشہور تھی۔

(۵) بروکلمن ۲: ۸۱ (۹۹)۔

۵۲ــمختصر مرویات ذی النون[1]: مشہور صوفی ذوالنون مصری کی روایات کا مختصر مجموعہ.

رجال ، سیر و تراجم :

۵۳ــرجال طحاوی[2] : طحاوی کی کتاب « شرح معانی الآثار » فقہ الحدیث کے موضوع اور آثار صحابہ کے مجموعے کی حیثیت سے اہم کتابوں میں سے ہے . قاسم نے اس کے رواۃ کے حالات جمع کیے ہیں.

۵٤ــرجال مؤطا محمد[3] : امام محمد کی مؤطا کے راویوں کے حالات.

۵۵ــرجال آثار محمد[4] : امام محمد کی «کتاب الآثار» ان احادیث و آثار کی بنیادی کتابوں سے ہے جن سے حنفیہ استدلال کرتے ہیں. اس میں امام محمد نے اپنی سند سے وہ روایات جمع کی ہیں جو امام ابو حنیفہ کے ذریعے انہیں پہنچیں . اس کے راویوں کے حالات میں قاسم نے یہ کتاب لکھی.

۵٦ــرجال مسند ابی حنیفہ لابن المقری[5] : ابن المقری کی مذکورہ بالا مسند کے راویوں کے حالات اس کتاب میں درج کیے ہیں .

۵۷ــترتیب الإرشاد للخلیلی[6] : حافظ ابویعلیٰ خلیل بن عبد اللہ بن احمد القزوینی الخلیلی (م ٤٤٦ ھ) حفاظ حدیث میں سے ہیں. انہوں نے اپنی کتاب «الارشاد فی علماء البلاد» میں ابتدائے اسلام سے اپنے وقت تک کے محدثین کا تذکرہ ممالک کے ناموں کی ترتیب سے کیا ہے. قاسم نے اس کی ترتیب بدل کر علماء کے ناموں کے پہلے حرف کے مطابق کردی ہے.

---

(۱) بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹).

(۲) الضوء ٦ : ۱۸٦ ؛ شذرات ۷ : ۳۲٦ ؛ کشف : ۱۷۲۸ او اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں اس کا نام « الإیثار برجال معانی الآثار » دیا ہے.

(۳) الضوء ٦ : ۱۸٦ .

(٤) الضوء ٦ : ۱۸٦

(۵) الضوء ٦ : ۱۸٦.

(٦) الضوء ٦ : ۱۸٦ ؛ کشف : ۷۰ ؛ « بستان المحدثین» میں اس کا « ارشاد فی معرفۃ المحدثین » دیا ہے .

۵۸ــمن رویٰ عن أبیه عن جدّہ[1] : بعض اوقات اسناد حدیث میں بجاے نام کی تصریح کے عن أبیه عن جدّہ ملتا ہے اور اس میں التباس ہوجاتا ہے کہ کس کے حد سے مراد ہے . قاسم نے اس کتاب میں ایسے لوگوں کے ناموں کی تصریحات کی ہیں اور راوی کی مراد سے مطلع کیا ہے .

۵۹ــ إصلاح ثقات العجلی[2] : حافظ ابوالحسن احمد بن عبدالله بن صالح العجلی (م ۲٦۱ ھ) مشہور محدث اور ماہر فن رجال ہیں . انہوں نے ثقه راویوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے قاسم نے پیش کردہ معلومات کی تصحیح کی ہے .

٦۰ــإصلاح زوائد العجلی[3] : زوائد سے مراد وہ راوی ہوتے ہیں جو صحاح سته کی اسانید میں نه آئے ہوں . عجلی نے ایسے راویوں کے حالات جمع کیے . قاسم نے اس کی بھی تصحیح کی. مختصر سی کتاب تھی .

٦۱ــزوائد رجال مؤطا[4] : قاسم نے « مؤطا » کے مذکورہ بالا قسم کے رواۃ کے حالات جمع کیے ہیں .

٦۲ــ زوائد رجال مسند شافعی[5] : « مسند شافعی » کے ایسے ہی راویوں کے حالات جمع کیے ہیں.

٦۳ــ زوائد رجال سنن الدارقطنی علی الستة[6] : دارقطنی کی سنن کے ایسے ہی رواۃ کے احوال .

٦٤ــالثقاة ممن لم یقع فی الکتب الستة[7] : قاسم نے راویوں کے

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ کشف : ۱٤٦٤ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ میں اس کا نام « کتاب من روی عن أبیه وجدّہ » دیا ہے.

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ نے نام « الاهتمام الکلی باصلاح ثقات العجلی » دیا ہے .

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷ (٤) الضوء ٦ : ۱۸۷ .

(۵) الضوء ٦ : ۱۸۷ (٦) الضوء ٦ : ۱۸۷

(۷) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ غالباً یہی کتاب ہے جس کا ذکر بروکلمن : تکمله ۲ : ۹۳ میں « الثقاة من الرواة » کے نام سے ملتا ہے ؛ شذرات ۷ : ۳۲٦ میں اس کا نام « ثقات الرجال » دیا ہے .

حالات جمع کیے ہیں جو اگرچہ ثقہ ہیں مگر ان کی روایت صحاح ستہ میں شامل نہ ہوسکی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی تھی۔

٦٥ـــ تقویم اللسان فی الضعفاء[1] : ابن حجر عسقلانی کی کتاب « لسان المیزان » میں جن راویوں کو ضعیف بتایا گیا ہے ان پر قاسم نے گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں تھی۔

٦٦ـــ اصول اللسان[2] : یہ بھی ابن حجر کی « لسان » پر لکھی گئی۔

٦٧ـــ حاشیہ علی مشتبہ[3] . ابن حجر کی کتاب « تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ » ایسے راویان حدیث کے بارے میں ہے جن کے قبایل، مقام سکونت، نام، کنیت، یا پیشے کے بارے میں باہم اشتباہ ہوجاتا ہے۔ اس پر قاسم نے حاشیہ لکھا ہے

٦٨ـــ حاشیة علی التقریب[4] . ابن حجر کی کتاب « تقریب التہذیب » پر حاشیہ ہے۔

٦٩ـــ تلخیص سیرة مغلطائی[5] . مغلطائی بن قلیج (م ٧٦٧ ھ) مشہور محدث نے سیرت نبوی پر ایک مشہور کتاب لکھی ہے اس کی تلخیص قاسم نے کی۔

٧٠ - تلخیص دولة الترک[6].

٧١ـــ منتقیٰ درة الاسلاک فی دولة الاتراک[7]: بدرالدین حسن ابن حبیب الحلبی (م ٧٧٩ ھ) نے ملوک عہد کی سن وار تاریخ لکھی جس میں ٦٤٨ ہجری کے اواخر تک کے حالات بیان کیے۔ اس کی عبارت نہایت مقفی مسجع اور

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧؛ کشف : ٤٧٠، نام صرف « تقویم اللسان » دیا ہے؛ ذیل تذکرة الحفاظ : ٣٥ ت؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠ میں اس کا نام « تقویم اللسان فی شرح المیزان » دیا ہے۔

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧؛ ذیل تذکرة الحفاظ : ٣٥ ت.

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧.

(٤) الضوء ٦ : ١٨٧

(٥) الضوء ٦ : ١٨٧

(٦) الضوء ٦ : ١٨٧

(٧) کشف : ٧٣٧، ٧٣٨

پیچیدہ تھی۔ ابن تغری بردی نے "المنهل الصافی" میں سلیمان بن مهنا کے ترجمے میں اس پر سخت اعتراضات کیے ہیں اور ایک دوسری جگہ بتایا ہے کہ مؤلف نے لوگوں کی پیدائش اور وفات کی تاریخ تک نہیں دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نگاری کے بجائے اس کا مقصد مقفی عبارتیں لکھنا تھا۔ قاسم نے اس کتاب کا انتخاب تیار کیا تھا مگر یہ انتخاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔

۷۲—منتقیٰ من درر الاسلاک فی قضاة مصر[1]۔

۷۳—تراجم مشایخ المشایخ[2]: قاسم نے اپنے اساتذہ کے اساتذہ کے حالات لکھے ہیں۔

۷۴—تراجم مشایخ شیوخ عصر[3]: اپنے ہم عصر علماء کے اساتذہ کے حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب بھی نامکمل رہی۔

۷۵—معجم الشیوخ[4]: قاسم نے اپنے اساتذہ کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیے ہیں۔

۷۶—تاج التراجم فی من صنف من الحنفیة[5]۔ صاحب تصیف حنفی علماء کے حالات میں ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا خیال قاسم کو مقریزی کے مؤلفہ تذکرہ کو دیکھ کر ہوا جس میں مقریزی نے حنفی علماء کے حالات بھی دیے تھے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۲، ۳، ٤، ایک ہی کتاب ہے جس کے نام کی روایت میں اشتباہ یا غلطی ہوگئی ہے۔

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷۔

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٤) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱؛ کشف : ۱۷۳۵۔

(٥) کشف : ۲٦۹؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰؛ الضوء ٦ : ۱۸۷؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹)، تکملہ ۲ : ۹۳؛ فہرس کتب خانۂ چسٹربیٹی (ڈبلن، ۱۹۵۵ء) ۱ : ۸۲، رقم: ۳۵۷۲ (۳)؛ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، ذخیرۂ فرنگی محل مخطوطہ رقم ۵۳۲ : ٥٤۔

اصول فقه:

۷۷۔حاشية على التلويح شرح التوضيح على متن التنقيح[1]: کچھ لوگوں نے بزدوی کی کتاب «الاصول» پر اعتراضات کیے تھے چنانچہ صدر الشریعۃ عبد اللہ بن مسعود المحبوبی البخاری (م ۷۴۷ ھ) نے ان مباحث کی تنقیح و توجیہ کرتے ہوئے اور «محصول»، «اصول ابن الحاجب» کے مباحث لے کر ان پر خود اپنی تحقیقات کا اضافہ کر کے «التنقیح» کے نام سے ایک متن اصول فقہ میں مرتب کیا۔ ایجاز و اختصار کی وجہ سے اس کی عبارت نہایت مشکل تھی چنانچہ خود ہی ایک مروج شرح «التوضیح» کے نام سے لکھی۔ اس شرح کی سب سے مشہور شرح سالقول تفتازانی (م ۷۹۲ ھ) نے «التلویح» کے نام سے لکھی۔ اسی شرح پر قاسم نے حاشیہ لکھا ہے[2]۔

۷۸۔شرح الورقات[3]: «ورقات»[4] اصول فقہ میں امام الحرمین الجوینی الشافعی (م ۴۶۸ ھ) کی مشہور تصنیف ہے۔ قاسم نے اس کتاب کی شرح کی ہے۔ یہ شرح ۸۲۰ ھ کے اوائل اور ۸۲۱ ھ کے اواخر کی تصنیف ہے۔ اس طرح یہ قاسم کی غالباً دوسری تصنیف قرار پاتی ہے۔

۷۹۔أجوبة عن اعتراضات العز بن جماعة على اصول الحنفية[5]: قاسم کے استاد عز بن جماعۃ شافعی تھے اور حنفیہ کے اصول فقہ پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ قاسم نے ان کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔

۸۰۔شرح مختصر المنار[6]: المنار حنفی اصول فقہ میں عبداللہ بن احمد

---

(۱) کشف: ۴۹۹۔

(۲) یہ حاشیہ صرف بحث سنت تک پہنچ سکا: شذرات ۷: ۳۲۶۔

(۳) الضوء ۶: ۱۸۷؛ کشف ۲۰۰۶؛ اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۱۔

(۴) اس نام کی وجہ مصنف کے دیباچے کے یہ الفاظ ہیں «هذه ورقات قليلة تشتمل على معرفة فصول من اصول الفقه»۔

(۵) الضوء ۶: ۱۸۷۔

(۶) الضوء ۶: ۱۸۷؛ اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۱؛ بروکلمن، تکملہ ۲: ۹۳؛ فہرس چسٹربیٹی لائبریری رقم: ۳۵۷۲: ۲؛ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری؛ ذخیرۂ فرنگی محل رقم ۵۹۹: ۲۰

حافظ الدین نسفی (م ۷۱۰ ھ) کا تالیف کیا ہوا مشہور متن ہے۔ اس کا اختصار طاہر بن الحسن بن عمر حبیب الحلبی نے کیا۔ قاسم نے اسی مختصر کی شرح کی ہے اور اس میں توجہ زیادہ تر حل الفاظ کی طرف کی ہے۔ تالیف کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ عثمان بن اغلبک الحلبی[1] نے ان سے طاہر کی مختصر المنار پڑھنا شروع کی تھی قاسم نے الفاظ کے حل کے لیے اسے یہ شرح املا کرادی[2]۔

۸۱۔حاشیة علی شرح المنار لابن ملک[3]: منار کی ایک متداول شرح عبداللطیف بن الملک (م تقریباً ۸۸۵ ھ) نے لکھی ہے قاسم نے اس شرح پر حواشی تحریر کیے ہیں۔

۸۲۔حاشیة علی شرح تنقیح الاصول لنقره‌کار[4]۔

۸۳۔تحریر الانظار فی أجوبة ابن العطار[5]: مختصر سا رسالہ ایک اصول فقہ کے مسئلے پر ہے «وهو فی قول المحققین من ائمتنا ان النفی والإثبات اذا تعارضا وکان (کان النفی) مما یعلم بدلیله فانه یقضی علی المثبت»۔

فرائض:

۸۴۔شرح فرائض کافی[6]: حافظ الدین نسفی کی کتاب «الکافی فی فروع الحنفیة» کے صرف اس حصے کی شرح ہے جو فرائض سے بحث کرتا ہے۔

---

(۱) عثمان بن احمد بن سلیمان بن اغلبک، فخر الدین، (م ۸۸۵ھ)، حلب کے امراء اور فقہ کے ماہرین میں تھا۔ اہم عہدوں پر سرفراز رہا۔ نظم و نثر، کتابت اور تاریخی وقائع میں شہرت حاصل تھی: الضوء ۵: ۱۲۵۔

(۲) مقدمه شرح مختصر المنار۔

(۳) کشف: ۱۸۲۵؛ اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۰۔

(٤) اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۰۔

(۵) الضوء ٦: ۱۸۷؛ کشف: ۳۵٦ میں اس کا نام «تحریر الانکار فی جواب ابن العطار» ہے اور اسماء المؤلفین ۱: ۸۳۰ میں «تحریر الانظار فی جوابه ابن العطار»۔

(٦) الضوء ٦: ۱۸۷۔

٨٥ـــشرح فرائض مجمع البحرين[1]: احمد بن علی بن ثعلب، مظفرالدین معروف بہ ابن الساعاتی کی کتاب «مجمع البحرین» کے صرف فرائض کی ممزوج شرح ہے۔

٨٦ـــشرح رسالة السيد فی الفرائض[2]: قاسم کے استاد السید علی نے، جو اپنے زمانے میں فرائض کے ماہر ترین آدمی سمجھے جاتے تھے، فرائض پر ایک رسالہ لکھا تھا جس کی شرح قاسم نے کی۔

٨٧ـــشرح مختصر الکافی فی الفرائض لابن المجدی[3]: قاسم کے استاد السید علی فرائض وحساب میں ابن المجدی کے شاگرد تھے۔ قاسم نے استاذ الاستاد کی کتاب کی شرح کی ہے۔ ضخیم کتاب تھی۔

٨٨ـــجامعة الاصول فی الفرائض[4]: یہ وہی کتاب ہے جس سے ٨٢٠ھ میں قاسم کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

٨٩ـــشرح فرائض السجاوندی[5]: «سراجیہ» کی شرح ہے۔

فقہ۔

٩٠ـــشرح قدوری[6]: ابوالحسین احمد بن محمد القدوری البغدادی (م ٤٢٨ھ) اکابر فقہائے حنفیہ میں سے ہیں۔ ان کی کتاب «المختصر» فقہ حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس کتاب پر بہت سے شرحیں لکھی گئیں جو اپنی جگہ خود مستقل کتابیں ہیں۔ قاسم نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١؛ شذرات ٧ : ٣٢٦.

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧.

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١ میں نام «شرح مختصر ابن المجدی فی الفرائض» دیا ہے۔

(٤) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠.

(٥) اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١.

(٦) الضوء ٦ : ١٨٧؛ کشف : ١٦٣٤ اور اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠ میں اس کا نام «الترجیح و التصحیح علی القدوری» دیا ہوا ہے؛ بروکلمن، تکملہ ٢ : ٩٣ میں نام «تصحیح القدوری» ہے۔

۹۱—شرح نقایہ[1] : صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود (م ۷٤٥ ھ) کی کتاب «مختصر الوقایہ» اور اس کا اختصار «نقایہ» جو ان کے صاحب زادے برھان الشریعۃ محمود بن صدر الشریعۃ الاول عبید اللہ المحبوبی نے کیا یہ دونوں کتابیں حنفی فقہ کے اھم ترین متون میں سے ھیں. «نقایہ» میں بےحد اختصار و ایجاز برتا گیا ھے جس کی وجہ سے فہم مطلب میں سخت دشواری ھوتی ھے چنانچہ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں. قاسم نے بھی اس کتاب کی شرح لکھی ھے. قاسم کے ایک مشہور ھمعصر تقی الدین ابوالعباس احمد بن الشمنی (م ۸۷۲ ھ) ھیں، انھوں نے بھی «نقایہ» کی شرح لکھی تھی. سخاوی کا کہنا ھے کہ شمنی، جو ان کے بھی استاد ھیں، کہا کرتے تھے کہ قاسم نے اُن کی شرح کو توڑ موڑ کر اپنی شرح تالیف کرلی چنانچہ انھوں نے «نقایہ» کی ایک اور شرح «اکمال الدرایۃ» کے نام سے لکھی جو ان کی موت سے کچھ ھی عرصے پہلے پوری ھوئی[2] .

۹۲—شرح دررالبحار للقونوی فی الفروع[3]: شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن الیاس القونوی الدمشقی الحنفی م ۷۸۸ ھ نے «دررالبحار» کے نام سے ایک مختصر متن تصنیف کیا جس میں فقہ حنفی کے مسائل ابن الساعاتی کی کتاب «مجمع البحرین» سے لے کر ان کےساتھ امام احمد بن حنبل، شافعی اور مالک کا مذھب بھی پیش کیا. قاسم نے اس کتاب کی شرح لکھی[4].

۹۳—شرح مختصر الطحاوی فی الفروع:[5] ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ کشف : ۱۹۷۱؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ میں بتایا ھے کہ کتاب نامکمل رھی.

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷ میں نام «شرح درر البحار فی المذاھب الاربعۃ» دیا ھے؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ : شذرات ۷ : ۳۲٦ .

(٤) قاسم نے اس کی شرح مختصر اور مطول دو طرح تیار کی تھی. مطول پوری نہ ھوسکی. الضوء ٦ : ۱۸۷ .

(٥) اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱

(م ٣٧١ ھ) نے فقہ میں مزنی کی کتاب «المختصر» کے نمونے پر اپنی «مختصر» ترتیب دی۔ قاسم نے اس کی شرح کی ہے۔

٩٤ اجوبة عن اعتراضات ابن العز[1]۔

٩٥—شرح مختصر المختصر[2]۔

٩٦—اجوبة عن اعتراضات ابن العز علی الهداية[3]: ابن العز کے «هدایه» پر اعتراضات کے جواب۔

٩٧—تصحیح علی مجمع البحرین لابن الساعاتی[4]۔

٩٨—شرح المختار للموصلی فی الفروع[5]: ابوالفضل عبدالدین الموصلی، کی کتاب «المختار» کی شرح ہے

٩٩—ترجیح الاقوال المعتبرة بین اصحابنا الحنفیه[6]: فقہ حنفی کے راجح و مرجوح مسائل کے بارے میں ہے۔

١٠٠—فتاوی قاسم بن قطلوبغا[7]: قاسم کی اس تصنیف کا ذکر سخاوی کی «الضوء» یا بقاعی کی «عنوان» میں نہیں ملتا۔ اگرچہ یہ حتمی دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ اس کو قاسم کے بعد جمع کیا اور ترتیب دیا گیا تاہم قاسم کے اکثر رسائل کا اس میں موجود ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ قاسم کے کسی شاگرد یا عقیدت مند نے اپنے استاد کی تحریروں کو جو فقہی مسائل سے متعلق تھیں یکجا کردیا ہو جیسا کہ ایک دوسری تصنیف کے بارے میں معلوم ہوگا۔ یہ کتاب جو قاسم کے علم، تفقہ، وسعت مطالعہ اور ذہانت کا بڑا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ فرنگی محل میں اس کا قلمی نسخہ

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧ .
(٢) الضوء ٦ : ١٨٧
(٣) الضوء ٩ : ١٨٧
(٤) شذرات ٧ : ٣٢٦
(٥) اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١
(٦) بروکلمن، تکمله ٢ : ٩٣
(٧) کشف، ١٢٢٧ «الفتاوی القاسمية»: اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١ بروکلمن ٢ : ٨١ (٩٩)؛ ذخیرۂ فرنگی محل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ رقم ٣١٠ : ١٩ ،

۲۴۳ اوراق پر مشتمل ہے اس نسخے پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تفصیلی فہرست مضامین ہے جس کا عنوان « فہرس فی فتاوی العلامة قاسم بن قطلوبغا الحنفی تلمیذ ابن الہمام، من المسائل والفوائد و الرسائل» ہے اور جس کی تاریخ تحریر ۱۲۹۵ ہجری ہے۔ اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا عبدالحی نے اس نسخے کو نقل کرایا تھا مگر تاریخ کتابت اور کاتب کا نام وغیرہ کچھ درج نہیں ہے۔ اس نسخے کے آخر میں قاسم کے استاد بھائی علامہ شمس الدین محمد بن محمد معروف به ابن امیر الحاج الحلبی کا رسالہ « تعریف المسترشد حکم الغرس فی المسجد » بھی شامل ہے جو ان کے قلم سے ۸۷۹ھ میں نکلا جب وہ حج سے واپسی میں بیت المقدس میں تشریف رکھتے تھے اور جو مسجد اقصی میں درخت لگانے کے بارے میں ہے۔ اس نسخے کے آخر میں جو عبارت ہے اس میں « تمت الفوايد . . . » لکھا ہوا ملتا ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ قاسم کی جو تصنیف « الفوايد[1] » کے نام سے ملتی ہے وہ بھی تو نہیں ہے جو « الفتاوی » کے نام سے بھی مشہور ہوئی ہو۔ مگر دقت یہ ہے کہ « فتاوی » کے نام سے بروکلمن جس کتاب کا نام دیتا ہے اسے علحدہ درج کرتا ہے، تاہم یہ قطعی دلیل اس بات کی نہیں کہ دونوں دو علحدہ کتابیں ہوں کیونکہ بروکلمن کا بڑا اعتماد کتب خانوں کی فہرستوں پر ہے اس لیے یقنی طور سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

۱۰۱ — مجموعۂ رسائل قاسم بن قطلوبغا[۲] : اس کتاب کا تذکرہ معروف فہارس میں نہیں ملتا۔ ذخیرۂ حبیب گنج میں مخطوطہ رقم ۱۸ : ۶ کا نام دستی فہرست میں « القول القایم » دیا ہوا ہے یہ صحیح نہیں۔ مخطوطے کے پہلے ورق پر جو نام دیا گیا ہے یعنی « مجموعہ رسایل شیخ قاسم بن قطلوبغا الحنفی و بعض فتاوی علماء مصر » وہ محتویات کتاب کے پیش نظر صحیح معلوم

---

(۱) بروکلمن ، تکملہ ۲ : ۹۳

(۲) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری ، ذخیرۂ حبیب گنج ، مخطوطہ رقم ۱۸ : ۶

ہوتا ہے۔ یہ نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم نے ۲۲ رجب ١٣٤٥ھ کو، جیسا نہ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے، حیدرآباد میں خریدا تھا۔ اس پر دو مہریں شاہی کتب خانوں کی لگی ہوئی ہیں اس نسخے پر جگہ جگہ محمد عبد العظیم المکی الحنفی[1] کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حواشی ہیں جو ١٠٥٠ھ میں مکہ معظمہ میں مفتی حنفیہ تھے۔ یہ نسخہ ایک دوسرے نسخے کی نقل ہے چنانچہ ورق ٥٣ الف پر حاشیے میں «من الأصل المنقول بیاض سطرین» اور اسی طرح ٥٢ ب کے حاشیے پر «فی الاصل بیاض سطرین» کے الفاظ ملتے ہیں۔ نسخے کے کاتب کا نام ٥ ب، ٥٤ الف اور ١٠١ ب پر دیا ہوا تھا جس میں سے پہلی اور آخری جگہ سے نام کھرچ کر مٹادیا گیا صرف ٥٤ الف پر جہاں نام غالباً اتفاقاً رہ گیا ہے یہ عبارت ملتی ہے :

«تاریخ یوم السبت حادی عشرین صفرالخیر عام ثمانیة و خمسین و تسعمایة علی ید الفقیر الی الله تعالی محمد بن یحیی الرسولی الحنفی لطف الله بهما آمین»

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٩٥٨ھ تک کاتب مذکور ٥٤ الف تک کتابت کر پایا تھا۔ نقل و کتابت کا اختتام جیسا کہ ورق ١٠١ ب سے ظاہر ہے سنیچر کی رات کو ١٠ صفر ٩٥٩ھ کو تحریر مذکورہ بالا کے قریب ایک سال بعد ہوا۔ ورق ١٠١ ب پر آخری سطور یہ ملتی ہیں :

«فرغت عن کتابته ید جامعه الفقیر المعترف بالعجز و التقصیر ابی محمد عبدالبر بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمود

---

(١) بروکلمن، تکملہ ٢ : ٩٤٨؛ ان کے رسالے «القول السدید فی بعض مسائل الاجتهاد والتقلید» کا ایک مخطوطہ ذخیرہ فرنگی محل رقم : ٤٥١ : ١٥٩ میں موجود ہے۔ گیارہ صفحے کا چھوٹی تقطیع کا رسالہ ہے۔ اس کے ساتھ «محمود بن احمد بن مسعود القونوی الحنفی کا رسالہ «فی عدم فساد الصلوة برفع الیدین فیها» اور علامہ بدرالدین الشهاوی کا رسالہ «یجوز اقتداء المتنفل بالمفترض لاعکسه» بھی مجلد ہیں۔ اس مجموعے کی تاریخ کتابت شعبان ١١٩١ھ ہے۔

بن الشحنة الحنفی غفر الله لهم و عفی عنهم فی یوم الخمیس الحادی و عشرین من شهر رمضان المعظم قدره و حرمته الواقع فی شهور سنة ثمانین و ثمانمایة ختمها الله بخیر... انتهی من المسودة التی کتبت عن مسودة المصنف رحمه الله تعالی بتاریخ یوم السبت حادی عشرین صفر الخیر عام ثمانیة و خمسین و تسعمایة علی ید العقیر الی الله تعالی محمد بن یحیی الرسولی الحنفی لطف الله بهما آمین »

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل منقول عنہ عبدالبر بن الشحنة کی تالیف اور انہیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ سال کتابت ۸۸۰ ھ ہے۔ فتنۂ ابن الفارض[1] اور قاسم کے تلامذہ کے ذکر[2] میں ہم بتاچکے ہیں کہ عبدالبر بن الشحنة (۸۵۱ ھ - ۹۲۱ ھ) اور ان کے والد محب بن الشحنة دونوں قاسم کے نیازمندوں میں سے تھے۔ عبدالبر کو فقہ قاسم ہی نے پڑھایا اور افتاء کی اجازت بھی انھوں نے ہی دی مگر بعد کو فتنۂ ابن الفارض کے سلسلے میں دونوں باپ بیٹوں کے تعلقات قاسم سے حد درجہ خراب ہوگئے تھے۔ فتنۂ ابن الفارض کا زمانہ ۸۷٤ ھ - ۸۷۵ ھ ہے۔ اس وقت عبدالبر کی عمر قریب ۲۳ سال کی تھی۔ اس واقعے کے چار پانچ سال بعد قاسم کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد عبدالبر نے ۲۸ سال کی عمر میں اپنے استاد کے بعض اہم رسائل کو بعض دیگر مصری علماء کے فتاوی کے ساتھ جمع کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد اور استاد میں ایک دینی مسئلے پر جو باہم کشیدگی ہوگئی تھی اسے موت نے بالآخر دور کردیا اور شاگرد کو استاد کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ قاسم کا ذکر انتہائی عمدہ الفاظ میں اس کتاب میں ملتا ہے مثلاً « کتاب القول القایم فی بیان تاثیر حکم الحاکم تالیف الشیخ الإمام العالم العامل العلامة وحید دهره

(۱) فضل الرحمن: قاسم بن قطلوبغا الحنفی، مجلۂ علوم اسلامیہ (دسمبر ۱۹۶۳ء) ص ۸۲۔

(۲) ایضاً: ۸۸: ۷۵۔

و فرید عصرہ ابی المعالی زین الدین قاسم الحنفی عامله الله بلطفه الخفی و والدیه » یا «قال شیخنا العالم العامل العلامة » وغیرہ. اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاسم کا پایہ فقہ میں کتنا اونچا تھا کہ مخالفوں تک کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا وہاں دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساری بدمزگی کے باوجود شاگرد تہ دل سے اپنے استاد کے تبحر علمی کا قائل تھا اور بعد موت اپنے مخالفتوں کے زخموں کو مندمل کردیا تو اس نے اس کے اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔

ذخیرۂ حبیب گنج کا زیر نظر نسخہ عبدالبر بن الشحنة کی موت کے ۳۸ سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مفتی محمد عبدالعظیم کے بعد ان کے صاحبزادے عبداللہ کے پاس رہا اور پھر پتا نہیں کس کس کی ملکیت میں منتقل ہوا۔ اس ادل بدل میں اس کے بہت سے اوراق ضائع ہوگئے۔ شروع میں ایک ناقص الاول فہرست مضامین ملتی ہے جو ورق ۸۱ سے آگے کی ہے۔ متن میں ورق ۷ کے بعد ورق ۳۸ ملتا ہے اس کے بعد پھر ۵۹ سے ٦٦ تک اوراق غائب ہیں اور اسی طرح ۷٤ سے ۹۹ تک۔ کل اوراق جن پر نمبر درج ہے ۱۰۱ ہیں۔ اس میں قاسم کے یہ رسائل ملتے ہیں: القول القایم؛ فی وقف السما دون الارض؛ فی شخص بیده حصة من عقار ثبت ملکه لها سنة احدی و خمسین و ادعی آخر انها له بحجة ثابتة ستة سبع واربعین؛ تزکیة الشهود، (ناقص الأول)؛ الفارة اذا ماتت فی الریت؛ تعلیق الطلاق بالنکاح؛ رجل استاجر وقفا من ناظر شرعی؛ مسئلة الإستبدال؛ العصمة عن الخطأ؛ رفع الاشتباه. ان کے علاوہ قاسم کے کچھ دوسرے مختصر فتاوی اور بعض دیگر علمائے مصر کے فتاوی اور رسالے بھی اس میں شامل ہیں۔ مثلاً ابن العطار کا رسالہ «فضل العلم علی الجهاد»؛ اوقاف کے بارے میں تفصیلی سوال اور ابن حجر العسقلانی الشافعی، سراج الدین عمر بلقینی الشافعی، قاضی ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی، علامہ محمد بن محمد عامر المالکی اور قاضی القضاة شہاب الدین احمد بن ابراہیم ابن نصراللہ ابن احمد الکنانی الحنبلی کے

جوابات[1]؛ طاعون کے بارے میں نہایت مفصل سوال اور صالح ابن عمر بلقینی، محمود عینی، اور محمد بن عامر مالکی کا جواب؛ ابن حجر کا رسالہ دربارۂ طاعون؛ بلقینی، عینی اور ابن عامر کے مختلف فتاوی دربارۂ حقوق مسیل، بیع فی المسجد، نزول عن الوظیفۃ، و سیاست؛ ابن حجر، بلقینی، شرف الدین موسی بن احمد السبکی الشافعیون، سعدالدین الدیری الحنفی، قاضی القضاۃ محب الدین ابو الفضل احمد بن نصر اللہ بن احمد بن محمد البغدادی ثم المصری الحنبلی، محمود عینی حنفی، ابن عامر مالکی کے فتوے مکان کی بیع کے بعد اس سے مکر ہوجانے کے بارے میں[2]؛ اور عبدالبر بن الشحنۃ کا رسالہ «زہر الروض فی مسئلۃ الحوض»۔ اس طرح یہ کتاب ان سب حضرات کے علم وتفقہ اور طرز استدلال کے تقابلی مطالعے کا اچھا مواد بھی فراہم کرتی ہے۔

۱۰۲—رسائل قاسم بن قطلوبغا: ذخیرۂ فرنگی محل میں اس مخطوطے کا نمبر ۳۱۱ : ۲۰ ہے اس میں رسائل قاسم اور ابن عبد الہادی الحنبلی تلمیذ ابن تیمیہ کی کتاب «الصارم المنکی علی نحر ابن السبکی» شامل ہیں۔ اس مخطوطے میں ۳۵۹ اوراق $23\frac{1}{4} \times 17$ کے ہیں۔ قاسم کے رسائل ص ۱۱۵ پر ختم ہوجاتے ہیں۔ ص ۷۴ پر مولانا عبد الحی کے ہاتھ کی یہ تحریر ہے «نقلت ہذہ الرسائل و الفوائد للعلامۃ قاسم بن قطلوبغا الحنفی تلمیذ ابن الہمام الحنفی من اصل علیہ خط المفتی عبدالعظیم المکی الحنفی فی مواضع و صححت بمقابلتہا فی شعبان سنۃ ۱۲۹۲ ہجری» جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا «مجموعہ رسائل» کی نقل مولانا عبد الحی صاحب نے اپنے لیے تیار کرائی تھی۔ جس وقت یہ نسخہ نقل ہوا ہے (۱۲۹۱–۱۲۹۲ ھ) اس وقت وہ اپنی مذکورہ بالا ناقص حالت ہی میں تھا۔ «مجموعہ» کے اوراق ۸ تا ۳۷ کا مواد اس میں سے بھی غائب ہے۔ اس کے علاوہ رسائل قاسم کا وہ حصہ ص ۷۲

(۱) صرف عینی تک جوابات مکمل ہیں۔ عینی کا جواب بھی ناقص الآخر ہے کیونکہ ورق ۵۹ سے اوراق غائب ہیں۔

(۲) صرف محب الدین حنبلی تک جواب مکمل ہیں۔ محب الدین کا جواب ناقص ہے اوراق ۷۴ ب سے غائب ہیں۔

پر ختم ہوجاتا ہے جو «مجموعہ» سے نقل کیا گیا۔ «بعض مسائل الطلاق» کی سرخی (مجموعہ ورق ۵۵ ب) پر مجموعے کا قاسم کے رسالوں والا حصہ تمام ہوتا ہے اور اسی سرخی ص ۷٤ پر زیر نظر نسخے کا رسائل قاسم کا حصہ بھی۔ چنانچہ ص ۷٤ پر مذکورہ بالا تصریح مولانا عبدالحی کے ہاتھ کی موجود ہے۔ ص ۷٤ تا ص ۱۱۵ کسی دوسری جگہ سے دوسرے کاتب سے نقل کرایا گیا ہے مگر منقول عنہ کے بارے میں نہیں بتایا گیا اتنا البتہ پتہ چلتا ہے کہ ص ۷٤ تا ص ۱۱۵ محرم الحرام ۱۲۹۱ھ میں نقل و صحیح[1] ہوچکا تھا۔ شروع کا حصہ بعد میں محمد بن عوض بن عبداللہ ابن ابی الحمل کے ہاتھ سے نقل ہوا اس کی تصحیح کی تاریخ ۱۲۹۲ھ ہے۔

۰۳ — الفوائد[2]۔ یہ کتاب غالباً مذکورہ بالا دونوں کتابوں میں سے ہی کوئی ہے۔

فقہی رسائل:

ذیل میں ہم ان رسائل کی فہرست دے رہے ہیں جو مسائل زیر بحث پر مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں ساتھ ہی مختصر سی تفصیل زیر بحث مسئلے کی بھی دی جاتی ہے تاکہ قاسم کے انداز بحث اور فقہی مہارت کا اندازہ ہوسکے۔

۱۰٤—الفارۃ اذا ماتت فی الربت[3]: قاسم نے بتایا ہے کہ علمائے حنفیہ

(۱) «کتبہ نور محمد، تحریر تاریخ بست و نہم شہر محرم الحرام ۱۲۹۱ ہجری روز پنج شنبہ غرہ صفر»، مولانا عبدالحی کے قلم سے: «صحت النسخۃ بالمقابلۃ باصلہانی رحب ۱۲۹۱ ہجری»

(۲) بروکلمن، تکملہ ۲: ۹۳۔

(۳) فتاوی قاسم بن قطلوبغا، ص ۲ تا ۱۳، مخطوطہ رقم ۳۱۰: ۱۹، ذخیرۂ فرنگی محل، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری؛ رسائل قاسم بن قطلوبغا ص ۳۰ تا ٤۰، مخطوطہ رقم ۳۱۱: ۲۰، ذخیرۂ فرنگی محل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری؛ مجموعۂ رسائل قاسم بن قطلوبغا، ٤٤ ب تا ٤۷ ب، مخطوطہ رقم ۱۸: ٦، ذخیرۂ حبیب الرحمن خاں شیروانی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری۔ اس مجموعے کا نام دستی فہرست میں «القول القایم» غلط درج ہوگیا ہے۔ «القول» اس کا ایک رسالہ ہے۔

کا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں روغن ناپاک اور ناقابل اکل ہوجاتا ہے ۔ کھانے کے علاوہ دوسرے استعمالات جائز ہیں ۔ بعض نے سیال روغن کو ماء قلیل و کثیر پر قیاس کیا ہے ۔ یہاں قاسم نے ضمناً اس امر کی تحقیق کی ہے کہ قلت و کثرت میں اعتبار مساحت کا ہوتا ہے یا حرکت کا ۔ اس کے بعد نہایت تفصیل سے طہارت کی فروع کا ذکر کیا ہے جس سے قاسم کی وسعت نظر کا پتا چلتا ہے ۔ مسئلہ اجمالاً یہ ہے کہ نجاست مثلاً لید وغیرہ حرق و انقلاب حقیقت سے پاک ہوجاتی ہے یا نہیں ۔ اس سلسلے میں ائمۂ فقہاء میں جو اختلافات ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ بحوالۂ «دررالبحار» امام ابو یوسف کے نزدیک ما استحال بالنار پاک نہیں ، امام محمد کے نزدیک پاک ہے اور اسی پر فتوی ہے ۔ چنانچہ قدوری نے «تقریب» میں بلا کسی اختلاف کے ذکر کے بتایا ہے کہ احتراق ہمارے اصحاب کے نزدیک مطہر ہے ۔ یہ احتلاف کہ جل جانے سے محمد کے نزدیک پاک ہوجاتی ہے اور ابو یوسف کے نزدیک نہیں ابن رستم کا روایت کردہ ہے ابن شجاع نے ابویوسف سے دو مختلف روایتیں نقل کی ہیں ۔ امام ابوحنیفہ کا ظاہر مذہب محمد کے موافق ہے ۔ چنانچہ تفریعاً زیت نجس سے بنا ہوا صابون پاک ہے ۔ اکثر مشایخ نے محمد کا ہی قول اختیار کیا ہے ۔

قاسم مزید بتاتے ہیں کہ اس مسلک کو ابن تمیمہ نے اصح قولی العلماء قرار دیا ہے ۔ ابن حزم کا بھی یہی مذہب ہے ۔ اس کے بعد امام مالک کے مذہب کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ابن حاجب کہتے ہیں کہ کثیر سیال کھانے میں اگر قلیل نجاست گرجائے تو اس کے بارے میں دو قول ہیں ۔ شیخ خلیل نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ ایک یہ کہ قلیل نجاست سے جیسے ماء کثیر نجس نہیں ہوتا اسی طرح یہاں بھی وہ غیر مؤثر ہوگی دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ مؤثر ہوگی ۔ ابن دقیق العید نے تاثیر و عدم تاثیر کو اس امر پر منحصر رکھا کہ اس نجاست سے بچنا مشکل ہے یا نہیں ، اگر مشکل ہے جیسے چوہے کی مینگنی سے تو وہ معاف ہے ورنہ نہیں ۔ جامد چیزیں مثلاً شہد اور جما ہوا گھی صرف اس حد

تک ناپاک ہوں گی جہاں تک نجاست سرایت کر جائے مقدار قلیل ہو یا کثیر، اتنے حصے کو نکال پھینکا جائے گا۔ ابن حاجب نے یہ بھی بتایا ہے کہ کھانے کے علاوہ نجس کے استعمال مثلاً جلانے یا چوپایوں کو کھلانے میں بھی دو قول ہیں اور خلیل نے بتایا ہے کہ ان میں سے مشہور قول جواز کا ہے مگر جلانے پر یہ قید ہے کہ مسجد میں نہ جلایا جائے۔ نجس روغن پاک ہوسکتا ہے یا نہیں اس میں بھی ابن حاجب کے مطابق دو قول ہیں اور خلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور قول یہ ہے کہ پاک نہیں ہوتا۔ ابن حاجب کا کہنا ہے کہ پاک ہوسکنے یا نہ ہوسکنے کے قول ہر ایسی نجاست میں جاری ہوں گے جس کے اعراض میں تغیر آگیا ہو مثلاً مردار کی راکھ۔ ابن حاجب کے علاوہ دوسروں نے عدم طہارت کو راجح بتایا ہے۔ امام احمد بن حنبل کے مذہب کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ زرکشی نے خرقی کی شرح کے حوالے سے بتایا ہے کہ سیال میں نجاست پڑجانے کے بارے میں تین قول ہیں ایک یہ کہ قلیل ہو یا کثیر ناپاک ہے فقہاء حنابلہ نے عام طور سے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ سیال کا وہی حکم ہے جو پانی کا یہ ابن تیمیہ کا مسلک ہے۔ تیسرے یہ کہ جس کی اصل پانی ہے مثلاً سرکہ وغیرہ اس کا حکم پانی کا ہے ورنہ نہیں۔ ناپاک روغن کے بارے میں اشہر الروایتین یہ ہے کہ چراغ میں جلانا جائز ہے، خرقی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ دوسری روایت عدم جواز کی ہے امام احمد نے ایسے روغن کو چمڑے پر لگانا اور اسے کھانا پینا ناجائز بتایا ہے اور یہی قول عام طور سے مالکیہ میں مشہور اور معتبر ہے۔ امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ ایسے غیر مسلم کے ساتھ اسے فروخت کرنا جائز ہے جو اس کی نجاست سے باخبر ہو۔ ابو الخطاب وغیرہ نے چراغ میں اس روغن کے جلانے کے جواز کی روایت پر اس کی بیع کے مطلقا جائز ہونے کی تخریج کی ہے کیونکہ جواز بیع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منتفع بہ ہے۔ پھر قاسم نے ابن مفلح الحنبلی کی «کتاب الفروع» کے حوالے سے بتایا ہے کہ کوئی نجس چیز استحالہ

اور آگ سے پاک نہیں ہوتی لیکن ایک روایت امام احمد سے یہ بھی ہے کہ ان دونوں طریقوں سے پاک ہوجاتی ہے۔ ابن مفلح نے یہ بھی بتایاہے کہ نجس روغن سے سانے ہوئے صابن کا پاک ہونا اسی قول پر مخرج ہے۔ ان مختلف فقہی مذاہب کے معتبر اقوال کو پیش کرنے کے بعد قاسم کہتے ہیں کہ امام مالک اور احمد سے مروی اقوال بھی ہمارے اقوال کی طرح ہیں، اختلاف صرف اس میں ہے کہ کون سے قول کو ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد نہایت تفصیل سے ان تمام احادیث کو پیش کرتے ہیں جو اس نزاع میں دلیل سمجھی جاسکتی ہیں اور مفصل گفتگو کے بعد دکھاتے ہیں کہ حنفیہ کا مسلک احادیث کے مطابق ہے۔ اس ضمن میں متعدد اصولی مباحث بھی زیر بحث آگئے ہیں مثلاً حدیث مرسل اور قول صحابی کا حنفیہ کے نزدیک حجت ہونا۔ اگر دو دلیلوں میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہو تو ایسی تعبیر اختیار کرنا کہ دونوں کارآمد ہوں اس سے بہتر ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو لغو اور بیکار کردیا جائے «إعمال الدليلين اولى من إهمال احدهما»

۱۰۵ــــالقول القايم فی بیان تاثیر حکم‌الحاکم[1] : یہ رسالہ اس مشہور مسئلے کی تحقیق میں ہے جس کا عنوان «نفاذ قضاء القاضي ظاهراً او باطناً» ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر قاضی عقود و فسوخ میں جھوٹی شہادت پر فیصلہ دے دے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ فیصلہ ظاہراً و باطناً دونوں طرح نافذ ہوگا امام ابو یوسف کا ایک قول تو یہی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ ایسا فیصلہ صرف ظاہراً نافذ ہوگا باطناً نہیں اور یہی قول امام محمد کا ہے۔ طحاوی نے بتایا ہے کہ اس بارے میں امام محمد کا قول وہی ہے جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔ ظاہراً نافذ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ فیمابین

(۱) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١ ؛ رسائل قاسم ص ۲ تا ۱۶؛ فتاوی قاسم ص ۳۲؛ تا ۳۳۸ : مجموعۂ رسائل قاسم بن قطلوبغا، ۱ الف تا ۵ ب، مخطوطہ رقم ۱۸ : ٦، ذخیرۂ شیروانی، علی‌گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری۔

الناس نافذ ہو مثلاً تمکین ، نفقہ اور قسم فی النکاح وغیرہ قانونی طور پر ثابت ہوجائیں گے اور انسان اور قانون ان کا احترام کریں گے . باطناً نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ باری تعالیٰ کے نزدیک ثابت ہو اور انسان عند اللہ گنہگار نہ ہو . ظاہراً نافذ ہونے اور باطناً نافذ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قاضی کے فیصلہ کے بعد قانون اس چیز کو سند جواز عطا کرے گا اور اس کا احترام کرے گا اگرچہ اللہ تعالی کے نزدیک وہ ثابت اور جائز نہ ہو اور جس کے حق میں فیصلہ دیا گیا ہے وہ اس سے استمتاع وغیرہ سے گنہگار ہو . ظاہر و باطن میں نفاذ کا مفاد یہ ہے کہ وہ قانونی اور اخلاقی دونوں طرح سے حلال و طیب ہو اس نفاذ کی شرط یہ ہے کہ دعوی کسی سبب معین کی بنا پر ہو مثلاً نکاح ، بیع ، طلاق یا عتاق اور قاضی گواہوں کے جھوٹا ہونے سے لاعلم ہو . اس پر سب کا اتفاق ہے کہ املاک مرسلہ میں صرف ظاہراً نافذ ہوتا ہے باطناً نہیں ، اور اسی طرح ان معاملات میں جہاں انشاء حکم ممکن نہیں مثلاً نکاح منکوحہ و معتدہ . چنانچہ عقود کی مثال یہ ہے کہ اگر عدالت میں کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کا دعوی کیا اور عورت منکر ہے ، اس پر وہ شخص دو جھوٹے گواہ پیش کردیتا ہے ، مدعی علیہا (عورت) منکوحہ یا معتدہ نہیں ہے اور قاضی اپنی دانست میں گواہوں کو معتبر سمجھکر یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ عورت اس شخص کے نکاح میں ہے تو امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے ایک قول کے مطابق اس شخص کو زناشوئی کے تعلقات رکھنا اور عورت کا اس کو اس امر کی اجازت دینا حلال و طیب ہے . امام محمد، زفر اور ابو یوسف کے دوسرے قول کے مطابق ان دونوں کے لیے یہ امر حلال نہیں عند اللہ وہ گنہ گار ہوں گے . یہی صورت اس وقت ہے کہ جب عورت دعوی نکاح کرے اور مرد انکاری ہو . امام مالک، شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کا بھی وہی مسلک ہے جو امام محمد اور زفر کا . یہ مسئلہ شروع سے بحث و تمحیص کی آماجگاہ رہا ہے اور سطح بین فقہاء واہل حدیث کے لیے امام ابو حنیفہ پر سخت

نکتہ چینی کا موقع فراہم کرنے والا ۔ قاسم بن قطلوبغا نے اس سلسلے کی ساری احادیث اور فقہی روایات کو پیش کرکے مسئلے کی مفصل تحقیق کی ہے اور بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا ہی مسلک زیادہ صحیح اور اسلام میں قاضی اور قضاء کے مقام سے زیادہ توافق اور اسلام کے قانون اور عدالتی نظریات سے مناسبت رکھنے والا ہے کیوں کہ قاضی کا فیصلہ از قبیل انشاء ہے نہ از قبیل اخبار ، قاضی کو ولایت عامہ حاصل ہے ، محل قابل انشاء ہے اور موانع مرتفع ، اس سب کے باوجود حکم کا نافذ نہ ہونا تعجب کی بات ہے ۔

۱۰۶ــ احکام الصلوة علی الجنازة فی المسجد[1] : شیخ الاسلام سعد الدیری نے ابراهیم بن الجیعان کی نماز جنازہ جامع ازهر کے اندر پڑھائی ۔ لوگوں کو ان کے عمل سے خیال ہوا کہ اس عمل میں کوئی کراہت نہیں ۔ صورت حال یہ ہے کہ امام شافعی تو اس کے جواز کے قائل ہیں مگر امام ابو حنیفہ ، ابو یوسف اور محمد کراہت کے قائل ہیں ۔ قاسم نے اس عمل کی کراہت پر دلیلیں قائم کی ہیں ۔

۱۰۷ــ مسائل التراویح و الوتر و جواز الصلوة بعد الوتر[2] : کسی محمد بدر الدین نے قاسم سے سوال کیا تھا کہ تراویح سنت ہے یا کچھ اور ، منفرد پڑھنا افضل ہے یا جماعت سے ، وتر کے بعد نفل پڑھنے سے وتر میں کچھ نقص تو نہیں پیدا ہوجاتا ۔ قاسم نے دلائل پیش کرکے بتایا کہ اس بارے میں اقامت بالجماعة سنت علی الکفایہ ہے ، تراویح مسجد میں جماعت سے چھوڑنے والا تارک فضیلت ہے نہ کہ مرتکب سیئہ ۔ اور

(۱) فتاوی ص ۱۳ تا ۲۰ ؛ رسائل ص ۱۱۵ تا ۱۱۸ ؛ کراهة صلوة الجنازة فی المسجد ، ص ۱۹۸ ب تا ۱۹۹ الف مخطوطہ رقم ۳۳۵ : ۴۳ ، ذخیرۂ فرنگی محل ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری ۔

(۲) فتاوی ص ۲۰ تا ۳۵ ؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ ، (۹۹) ، «رسالة فی الصلوة بعد الوتر هل هی من النوافل او لا» ۔

امام ابو حنیفہ، محمد، ابو یوسف کے نزدیک نفل بعد وتر میں کوئی حرج نہیں اس سے وتر میں کوئی نقص نہیں آتا۔

۱۰۸۔۔الفوائد الجلة فی مسئلة اشتباه القبلة[1]: یہ رسالہ تحری کے مسئلہ پر ہے۔ «وقایہ» «شرح وقایہ» «نقایہ» اور «مختارات النوازل» لصاحب الهدایة کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتباہ سمت قبلہ کی صورت میں اگر نماز شروع کردی تو نماز ادا نہیں ہوگی چاہے سمت قبلہ ہی میں پڑھی ہو کیونکہ تحری کے ترک سے ترک واجب ہوا۔ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ عبارتیں اس موقع کے لیے ہیں جب نماز بلا تحری شروع کرنے کے بعد دوران نماز معلوم ہوا کہ سمت قبلہ صحیح ہے کیونکہ صاحب «وقایہ» نے اس سے قبل یہ کہا ہے کہ «فان قبلها و عدم من یسأل تحری ولم یعد بعد اذا احطأ و ان علم به مصلیا او تحول رایه الی احری استدار و ان شرع بلا تحر ثم علم انه اصاب قال ابو یوسف مضی فیها ولا یستأنف»۔ «احتیار» اور دوسری کتب فقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد فراغ معلوم ہوا کہ صحیح سمت میں نماز پڑھی ہے تو نماز ہوگئی کیونکہ تحری بطور وسیلے کے فرض ہے، مقصود اس کے بغیر ہی حاصل ہوگیا تو کچھ حرج نہیں۔ قاسم نے اصل مذہب کی تحقیق کی ہے۔

۱۰۹۔۔احکام القهقهة[2]: قاسم سے پوچھا گیا کہ امام زرکشی نے اپنی کتاب «الحواشی علی الرافعی» میں حنفیہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حدیث قہقہہ (قہقہہ سے نماز فاسد ہوجاتی ہے) نماز فرض کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ حنفیہ نفل نماز کو اس پر قیاس کرتے ہیں اور قہقہہ کو نفل نماز کا بھی مفسد بتاتے ہیں۔ تو یہ معاملہ اگر تعبدی ہے تو نفل کو اس پر کیسے قیاس کیا اور اگر معلل ہے تو نماز جنازہ کو اس پر قیاس

---

(۱) فتاوی ص ۳۵ تا ٤٤؛ الضوء ٦ : ۱۸۷؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳٦ فی مسئلة اشتباه؛ کشف : ۱۲۹٦۔

(۲) فتاوی ص ٤٤ تا ٤۹؛ رسائل ص ۷۷ تا ۸۳۔

کیوں نہ کیا. بعض حنفیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ امر تعبدی ہے اور نفل نماز کو اس صورت میں دلالۃ النص کے طور پر فرض سے ملحق کیا گیا ہے نہ کہ بذریعہ قیاس یہ حکم ثابت کیا گیا ہے کیونکہ نفل نماز صلاۃ حقیقی ہے اور نماز جنازہ صلاۃ حقیقی نہیں ہے . قاسم نے بتایا ہے کہ یہ امر تعبدی ہے نفل کو فرض پر قیاس نہیں کیا ہے بلکہ عموم لفظ پر عمل کیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے «من ضحک فی الصلوۃ قہقہۃ فلیعد الوضوء و الصلوۃ» . جنازہ کی نمار اس میں داخل نہیں ہوتی کیوں کہ وہ صلوۃ مطلق نہیں . پھر بتاتے ہیں کہ بعض حنفیہ کی طرف سے جو مذکورہ جواب دیا گیا ہے وہ صحیح نہیں . نفل کو بطریق دلالت‌النص فرض سے ملحق کر ہی نہیں سکتے اس پر دلائل قائم کیے ہیں اور دلالۃالنص کی تشریح کرتے ہوئے مثالیں دی ہیں .

۱۱۰ ـ الاصل فی بیان الفصل والوصل[1] : قاسم کے کسی استاد نے ان سے سوال کیا کہ فرض نماز کے بعد اسکے ساتھ نفل کا ملانا کیسا ہے اور یہ بھی کہا کہ بعض حنفی علماء کا کہنا ہے کہ اس وصل کو حافظ الدین نسفی نے اختیار کیا ہے ورنہ متقدمین فقہاے حنفیہ کے یہاں یہ بات نہیں ملتی . قاسم نے بتایا ہے کہ اس مسئلے کو نسفی سے پہلے بہت سے فقہاء نے لکھا ہے اور ثبوت میں امام محمد کی الأصل، بدائع، شرح الشہید، ذخیرۃ شمس‌الایمۃ حلوانی اور اختیار شرح مختار کے حوالے پیش کیے ہیں اس ضمن میں مختلف فقہا کے سنین وفات کی بھی تحقیق کی ہے .

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ : الأصل فی الفصل و الوصل یعنی وصل التطوع بالفریضۃ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف ؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹): رسالۃ فی وصل التطوع ؛ فتاوی ص ۵۰ تا ٦۰ ؛ رسائل ص ۱۲۲ تا ۱۲۵ ؛ رسالۃ الأصل فی بیان الوصل و الفصل ای وصل السنن بالفرائض وفصلہا بالاوراد ؛ الأصل فی بیان الوصل والفصل ص ۲۰۰ تا ۲۰۱ ، مخطوطہ رقم ۳۳۵ : ٤٤ ، ذخیرۃ ... [illegible]

۱۱۱ - الأسوس فی کیفیة الجلوس[1] : جلوس بین السجدتین کے بارے میں کسی نے دریافت کیا۔ قاسم نے بتایا کہ جو ہیئت جلسۂ تشہد کی ہے وہی اس کی بھی ہے ۔ سائل نے کہا کہ بعض معاصر علماء نے اس کی کیفیت یہ بتائی ہے کہ پیر کھڑے کرکے ایڑیوں پر بیٹھے۔ قاسم نے بتایا کہ یہ نشست إقعاء کہلاتی ہے اور اس کی کراہت منصوص ہے اور سائل سے یہ بھی پوچھا کہ کتب حنفیہ میں یہ مسئلہ کہاں دیکھا ۔ سائل نے کہا کتاب تو مجھے معلوم مگر سراج الدین قاری الهدایة (المذکور سابقا) نے یہ مسئلہ بتایا ہے ۔ قاسم نے اپنے رسالے میں کیفیت نشست کی تحقیق کی ہے ۔ قاسم کا کہنا ہے کہ نشست کی پانچ صورتیں ہیں : ۱ - التربع ۲ - ان یضجع قدمیه ویجلس علیهما ۳ - ان ینصب ساقیه و یلزق الیتیه بالارض و یدیه وهذا هوالإقعاء المشهور ٤ - ان ینصب رجله الیمنی ویؤخر الأخری و یجلس علی الأرض و هذا هو التورک ٥ - ان ینصب قدمه الیمنی و یفرش الأخری ویجلس علیه و هذا هو الإفتراش اس کے بعد نبی کریم علیه الصلوۃ والسلام اور صحابہ کے عمل کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ نشست کا طریقہ کیا تھا ۔ قاسم کہتے ہیں کہ تربع نماز کے سارے جلسات میں مکروہ ہے اسی طرح اضجاع القدمین بھی ، نصب القدمین و الجلوس علی العقبین بھی نماز کی تمام نشستوں میں مکروہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف علاوہ اس قول کے نہیں ہے جو نووی نے «شرح المهذب» میں امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے کہ اس طرح دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا مستحب ہے ۔ امام ابو حنیفه ، امام ابو یوسف اور امام محمد تینوں سے اس کی نہی منقول ہے ۔

۱۰۲ - تحریر الأقوال فی صوم الست من شوال[2] : ابو عبدالله محمد بن

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف ؛ فتاوی ص ٦١ تا ١٧٧ ؛ وسائل ١٢٦ نامکمل ؛ مخطوطه رقم ٣٢٥ : ٤٣، ذخیرۂ فرنگی محل ص ٢٠٢ تا ٢٠٣ ۔

(۲) فتاوی ص ۷۷ تا ۸۷ ؛ ذخیرۂ فرنگی محل ، مخطوطه رقم ۹۰ : ٤٩ ،

طیبغا الحنفی نے شیخ جلال‌الدین القسانی کے منظومے کی مندرجہ ذیل عبارت قاسم کے پاس غرض تحقیق بھیجی :

« و فی صیام الست من شوال کراھۃ عند اولی الأفضال
و قوله فی شرحها : ای یکره صوم الست من شوال متتابعا و متفرقا عد ابی حنیفة وعن ابی یوسف یکره متتابعا لامتفرقا وقال مالک یکره علی کل‌حال و ھذا وظیفة الجهال و کل حدیث فیه فہو موضوع ذکره فی کتاب التفسیر وصوم شهر رمضان نسخ کل صوم کان قبله والاضحیة نسخت کل دم کان قبلها وقیل لایکره وھو قول محمد و الاول اصح لمافیه من التشبه بأھل الکتاب لانهم یلحقون الفرض مالیس منه. انتهی محروفه »

قاسم نے بتایا کہ یہ سب محض غلط ہے ۔ « عند ابی حنیفة » والی عبارت «المحیط الکبیر» سے منسوب کی جاتی ہے مگر «محیط رھانی» اور «ذخیرۂ برھانیہ» میں یہ عبارت اس انداز سے ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلاف اصول ہے اور «ذخیرہ» میں اس پر یہ تعقیب ملتی ہے کہ اس کا الٹا صحیح ہے اور «محیط» میں بھی ایسا ہی ہے ۔ امام ابو یوسف کی طرف جو چیز منسوب کی گئی ہے وہ « نقل مختل » ہے ۔ کتب فقہیہ کی عبارت متفقہ طور پر یہ ہے کہ ابو یوسف سے کرخی کے الفاظ میں اس طرح منقول ہے کہ «کانوا یکر ھون» ان یتبعوا رمضان صیاماً خوفا ان یلحق ذلک الفریضة » اس عبارت سے صاحب حقایق نے یہ مطلب سمجھا کہ تتابع مکروہ ہے اور اس کی تاویل کی ۔ صاحب بدایع کے نزدیک مکروہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ ایک روزہ عید کے دن اور پانچ اس کے بعد رکھے ۔ یہ مطلب حسن بن زیاد لؤلؤی کے املا سے لیا گیا اور یہ کہنا ضعیف و ماؤل روایت پر اعتماد کرنا ہے ۔

اس کے بعد قاسم نے امام ابو حنیفہ کے اصحاب سے لے کر اپنے مشایخ تک کی حنفیہ کی معتمد علیہ روایات پیش کی ہیں چنانچہ امام محمد ، حسن بن زیاد ، طحاوی ۔ ابواللیث سمرقندی صاحب «نوازل» ، الحسام الشہید صاحب

«واقعات» ابو جعفر عمر النسفی، صاحب «ہدایہ» و «تجنیس» قاضی خان، صاحب «الحقایق» امام الزوری السدیدی، صاحب «ینابیع» ابوبکر اسماعیل امام محمد بن حامد، صاحب «المنتقی»، صاحب «کافی»، «وافی و مصفی»، صاحب «مجمع البحرین» صاحب «غایۃ» اکمل الدین بابرتی سب کو حوالے میں پیش کیا ہے پھر «وظیفۃ الجہال» پر تنقید کرتے ہوئے احادیث و آثار سے مذکورہ بالا روزوں کی افضلیت و استحباب پر دلائل قائم کیے ہیں۔

۱۱۳—القول المتبع فی الکنائس والبیع[1]: قاسم سے مصر کے کلیساؤں اور یہودیوں کے معبدوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا کہ ان کا کیا حکم ہے۔ قاسم نے بتایا کہ حکم کی بنیاد یہ امر ہے کہ مصر مسلمانوں کے زیرنگیں کس طرح آیا: عنوۃً یا صلحاً۔ اس کے بعد فقہائے مذاہب اربعہ کی آراء کو پیش کیا ہے اور ان میں باہم جو اختلافات ہیں ان کی وضاحت کی ہے۔ فقہاء حنفیہ اس پر متفق ہیں کہ مصر عنوۃ فتح ہوا۔ مالکیہ کی رائے میں مصر ارض وقف ہے۔ شافعیہ میں اس بات میں کہ عنوۃ فتح ہوا یا صلحاً باہم اختلاف ہے۔ قاسم بتاتے ہیں کہ قول راجح شوافع کا یہی ہے کہ عنوۃ فتح ہوا۔ حنابلہ بھی یہی کہتے ہیں کہ عنوۃ فتح ہوا۔ ہر ایک مذہب جن روایات سے استدلال کرتا ہے انھیں پوری تفصیل سے پیش کیا ہے پھر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ «وحاصلہ ان الصحیح العنوۃ»۔ اس کے بعد اس فقہی دعوے کو تاریخ سے ثابت کیا ہے اور تفصیلی طور پر مستند مآخذ سے فتح مصر کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس میں اسکندریۃ برقہ، طرابلس وغیرہ سب کی فتح کے حالات آگئے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ عنوۃ فتح ہو تو اس کے کیا احکامات ہیں اور صلحاً ہو تو کیا ہیں اور ان دونوں صورتوں میں غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کے احکام میں جو فرق ہوجاتا ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے اربعہ کے مسالک کا مفصل ذکر کیا ہے۔

(۱) العنوہ ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء ۱ : ۸۳۱ ؛ کشف : ۱۳٦٤ ؛ چسٹربیٹی [illegible] فہارس ص ۲٦۸ تا ۳۲۱ ۔

١١٤ـــاحكام الشهادة و التزكية[1] : ایک مالکی المذہب قاضی کے سامنے ایک آدمی پر شہادت دی گئی جس سے اس کی تکفیر لازم آتی تھی۔ قاضی مشہود علیہ کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر تعدیل و تزکیۂ مشہود اس کے لیے دشوار تھا چنانچہ اس نے یہ کیا کہ ایک حنفی قاضی کے پاس گواہوں کو تزکیہ و تعدیل کے لیے بھیج دیا کہ وہ تزکیہ کرکے مطلع کرے۔ یہ معاملہ قاسم کے علم میں لایا گیا قاسم نے کہا کہ مالکی قاضی کی یہ حرکت تحامل خفی کی علامت ہے اور حنفی قاضی نے فتوی اور عمل دونوں میں غلطی کی ہے چنانچہ تفصیل کے ساتھ تزکیہ شہود پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تزکیہ کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ تزکیہ بالسر کسے کہتے ہیں تزکیہ بالعلانیۃ کیا ہوتا ہے، کس کی شہادت قبول ہوگی اور کس کی نہیں۔

١١٥ــــاحكام الأشربة و طبخ العصير[2] : اسکندریہ سے ایک استفتاء اشربہ اور طبخ العصیر کی اقسام، کیفیات اور احکام کے بارے میں آیا یہ اس کا جواب ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن رمضان کی «الينابيع شرح مختصر القدوری» کے حوالے سے قاسم نے بتایا کہ أشربہ کی آٹھ قسمیں ہیں: خمر، سکر، نقیع الزبیب، نبیذ التمر، المضیح، البادق، الطلاء، اور الجمرودی۔ پھر تفصیل سے ان کے بنانے کے طریقے اور احکام بتائے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی حرمت کے فقہی مدارج کیا ہیں اور کس کی حرمت سے انکار پر تکفیر لازم آتی ہے اور کس سے نہیں۔ اس کے بعد حسام الدین شہید کی نہایت تفصیلی بحث طبخ العصیر کے موضوع پر بتمامہا نقل کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ طبخ العصیر کے مسایل کے علم کے لیے چھ چیزیں ضروری ہیں : اولها : القدر التی یطبخ فیها العصیر ؛ و ثانیها : کیفیة الطبخ ؛ و ثالثها : العمل فیه بالحساب ؛ و رابعها : المقادیر التی یحتاج الیها ؛ و خامسها : اقسام المسائل التی یقع العمل فیها الحساب ؛ وسادسها : الاصل الذی علیه یدور تخریج المسائل ۔

---

(١) فتاوی ص ١١٧ تا ١٥١ ؛ مجموعه ص ٣٨ ناقص الاول ۔

(٢) فتاوی ١٥١ تا ١٦٨ ۔

۱۱٦ ـــالدین المشترک[1] : قدوری کی کتاب الصلح کی ایک عبارت «الا ان یضمن له شریکه ربع الدین» کی تشریح اور صلح کی تفصیلی فروعات پر یہ رسالہ ہے ۔

۱۱۷ ـــرسالة فی القراءات الغیر المشهورة[2] : کسی نے بعض غیر مشہور قراءتیں پیش کرکے دریافت کیا کہ اگر ان قراءتوں کے مطابق نماز میں قرآن مجید پڑھا جائے تو نماز ہوجائے گی یا نہیں قاسم نے بتایا ہے کہ ان قراءتوں کا قاری ابو عبد اللہ محمد بن السمیفع الیمانی ہے جو معروف آدمی ہے ۔ بعض لوگوں نے اسے قراء مکیین میں سے بتایا ہے ۔ اس کی قراءت پر کچھ لوگوں نے پڑھا بھی ہے ۔ لیکن اس قراءت کی سند صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر چہ اس کی قراءت کے طرق محمود البصری ، محبوب بن حسن العلائی اور عبدالوہاب الخفاف ہیں مگر اس کا مدار اسمعیل بن مسلم المکی پر ہے جو غیر معروف ہے اور ایسا ہونا شذوذ کی دلیل ہے ۔ شاذ قراءت سے «کافی» کے مطابق نماز فاسد نہیں ہوتی ۔

۱۱۸ ـــرسالة فی القراءات العشر[3] : قراءات عشر کے بارے میں قاسم سے پوچھا گیا کہ یہ متواتر ہیں یا نہیں ۔ قاسم کی تحقیق یہ ہے کہ اگرچہ مشہور یہ ہے کہ یہ قراءتیں متواتر ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ یہ مشہور ہیں ۔ قاسم نے اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مقروء الأیمة تو متواتر ہے مگر ان کی قراءتیں مشہور ہیں ۔ قراءات عشرہ کو متواتر سمجھنا غلط فہمی اور خلط مبحث ہے ۔ پھر بتایا کہ «مرشد و جیز» میں ہے کہ یہ دسوں قراءتیں بطریق احاد نقل ہوئی ہیں مگر قاسم کو اس سے اتفاق نہیں چنانچہ ان کے مشہور ہونے پر دلائل قائم کر کے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے اور طریق ادات بھی بتائے ہیں ۔ شاذ قراءتوں سے نماز ہوتی ہے یا نہیں ہے اس بارے میں فقہاء کے مذاہب کی تفصیل بھی پیش کی ہے ۔

---

(۱) فتاوی : ۱٦۸ تا ۱۸۰ ۔
(۲) فتاوی : ۱۹۲ تا ۱۹۵ ۔
(۳) فتاوی : ۱۹٦ تا ۲۰۷ ؛ زرکلی : الأعلام ؛ رسائل ۹۹ تا ۱۱٤ ۔

۱۱۹ـــاجارة الوقف[1]: قاسم کے پاس وقف کے بارے میں ایک سوال آیا جس کی عبارت یہ تھی:

«رحل استاجر وقفا من ناظر شرعی ثم ان الموجر عزل وتولی ناظر آخر فادعی علی المستاحر ان الاحارة بدون احر المثل واحاب المستاحر بانه اثبت احارته علی حاکم حنفی وان من مذهبه ان الاحارة فی مثله اذا کانت بدون احر المثل علی الناظر تمام احر المثل وسئل الحاکم من ذلک»

اور معلوم کیا گیا کہ اس اجارہ وقف کی شرعی حیثیت کیا ہے. قاسم نے جو جواب دیا اس کا ماحصل یہ تھا:

«ان الثبوت المذکور ان کان عن دعوی شرعیة من حصم واستوفت الشرایط و تعرض الحاکم فی الثبوت علیه ان المسمی باحر المثل ولا منازعة للناظر الثانی، الا اذا ازدادت الرغبات فی العین الموقوفة و صار المسمی دون احر المثل فحینئذ للقاضی ان یصح الاحارة و یحددها باحرالمثل، إما من المستاحر الاول او من غیره من الراغبین بشرط؛ وان کان الثبوت المذکور انما هو ایصال حریان العقد بالقاضی فللناظر الثانی مطالبة المستاجر بتمام احر المثل للمدة التی کانت العین فی یده فیها و فسخ الاحارة واعادها باحرالمثل. و قول القاضی ان مذهبه ذلک لوصح کان فتوی لا حکما»

پھر قاضی کے قیاس میں غلطی کی نشاندھی کی ہے. قاسم کو بعد میں معلوم ہوا کہ شہر کے بعض علماء قاضی کی موافقت میں رائے رکھتے ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں تین روایات ہیں چنانچہ قاسم نے مزید تحقیق کرکے یہ رسالہ تیار کردیا.

۱۲۰ـــتضمین ما ضاع عند الشریک من المال المشترک[2]: قاسم کے

---

(۱) فتاوی ص ۲۰۹ تا ۲۱۷؛ رسائل ص ٦٠ تا ٦٤؛ مجموعه ص ۵۲ الف تا ۵۳ ب. غالباً یہ وہی رسالہ ہے جس کا نام «دفع المضرات من الأوقاف و الخیرات» ہے: کشف ۷۵۷؛ اسماء ۱: ۸۳۰

(۲) فتاوی ص ۲۱۹ تا ۲۳٤.

پاس ایک استفتاء آیا جس کی عبارت یہ تھی:

«رجل اشتری نصف فرس من شریکه و تسلم و انتفع بها برکوبها باذن شریکه ثم بعد مدة نهبت؛ فهل یقال لایضمن حصة شریکه لکون ید الشریک ید امانة، ام یقال بضمن لانه مستعیر فان حد العاریة و هو اباحة الانتفاع بمال الغیر بغیر عوض صادق علیه والعاریة مضمونة إلا فیما استثنی ولیس النهب فیما استثنی، فیجاب عن قولهم ید الشریک امانة فانه قول محمول علی الشرکة العاریة عن الانتفاع بغیر عوض جمعا بین هذا و بین ما اقتضاه کلامهم انها عاریة»

اس استفتاء پر حسب ذیل جوابات موجود تھے:

١—محمدالأندلسی المالکی: «مذهب مالک کے موافق بالاتفاق ضمان نہیں (مع دلیل). اصول حنفیہ کے مطابق بھی اس پر ضمان نہیں (مع دلیل). مذهب شافعی کی رو سے صحیح یہی ہے کہ شریک، مذکور پر ضمان نہیں (مع دلیل). یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ عاریت ہے اس کے دلائل دیے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ یہ مسئلہ باب عاریت سے نہیں باب قسمة المنافع سے متعلق ہے».

٢—ابن قاصی شهبة الشافعی: اس پر ضمان ہے (مع دلیل)

٣—عمر الحمصی الشافعی: ضمان ہے (مع دلیل).

٤—محمد بن زهرة الشافعی: ضمان نہیں ہے (مع دلیل).

قاسم نے اپنا جواب اس تعریض سے شروع کیا:

«إن السؤال لمتفقه، والأجوبة أجوبة أعیان من ینسب إلیهم العلم. و فی کل منها بحث، أحببت أن أذکر ذلک لیعلم أن بعض من حصلت لهم الشهرة لم یطابق فهمه الخبر»:

سوال کا انداز بتاتا ہے کہ سائل خود فقه کے علم کا دعوی رکھتا ہے اس لیے قاسم نے پہلے تو سوال کے ایک ایک جزء پر تفصیلی بحث کی اور اس کی غلطیاں واضح کیں، پھر جوابوں پر تنقید کی، سائل پر

تنقید کرتے ہوئے قاسم لکھتے ہیں کہ سب سے بڑی غلطی جو سائل سے ہوئی ہے وہ یہ کہ «ید الشریک فیما نحن فیہ» جسے سائل ید امانت سمجھتا ہے وہ کسی فقیہ اہل علم کے نزدیک ید امانت نہیں ہے۔ یہ صورت تو شرکت اموال کی اس صورت میں ہوتی ہے جسے شرکة العقود کہا جاتا ہے مثلاً مفاوضہ اور عنان وغیرہ اور جو صورت زیر بحث ہے وہ شرکت املاک و شرکت عین کی ہے جس کے بارے میں اجماع ہے کہ ہر ایک اپنے شریک کے حصے میں اجنبی ہوتا ہے۔ سائل نے جو تعریف عاریت کی دی ہے قاسم نے اس میں بھی متعدد غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ تعریف محض من گھڑت ہے پھر پورے استفتاء پر بحیثیت مجموعی تنقید کی ہے۔ جوابوں پر تنقید کرتے ہوئے قاسم نے پہلے جواب کے بارے میں لکھا ہے «فالأول کلام متدافع بعید عن التحقیق» کیونکہ مجیب کی اس بات سے کہ «أما علی مذهب مالک لاضمان باتفاق لانها إن کانت علی وجه الشرکة فهی امانة و ان کانت عاریة فلا ضمان ایضاً» سے معلوم ہوتا ہے کہ حصر ان دو صورتوں میں سے ایک میں کیا گیا ہے۔ پہلی صورت تو بے معنی ہے کیونکہ اس کا قائل کوئی نہیں۔ وجہ یہ کہ زیر بحث اشتراک میں ایک شریک دوسرے شریک کے حصے پر قابض ہوتا ہے۔ اصول حنفیہ کے مطابق جو جواب دیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ اسے باب عاریت کے علاوہ دوسرے باب سے بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب شافعی کے مطابق شریک مذکور پر ضمان نہیں کیونکہ وہ امین ہے یہ بھی غلط ہے۔ ائمۂ شوافع میں سے کوئی اس کا قائل نہیں کہ اگر کسی نے سواری یا مکان کا ایک حصہ خریدا تو اس کا ید اس کے شریک کے ید کے مانند ہے اس کے برخلاف وہ یہ صراحت کرتے ہیں کہ ہر ایک اپنے شریک کے حصے میں اجنبی ہے پھر لکھتے ہیں: «و أما بعد الإذن فی الاستعمال فالکلام فیه بل هو عارية (ولا فاين هذا من ذاک» مجیب کے اس قول سے کہ یہ باب قسمة المنافع ہے قاسم نے خود ان کے جوابات مذکورہ کی تردید کی ہے اور دونوں

کو متناقض بتایا ھے ۔ مجیب ثانی نے سائل کے احتمال ثانی کو صواب بتایا تھا کہ ید شریک ید امانت اس وقت سمجھا جاتا ھے جب معاملہ عاریت کا نہ ہو، شریک تو غاصب بھی ہوسکتا ھے تو اسے ضمان سے کیسے بری کیا جاسکتا ھے ۔ قاسم اس احتمال ثانی کی تصویب پر وھی تنقید کرتے ہوئے جو سائل پر کی تھی، ید شریک کو ید امانت سمجھ بیٹھنے کی غلط فہمی کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ھیں «و ھذه وهلة وقع فيها السائل، و يقعه المجيبون ملا تأمل» اور جواب کے ہر جزء پر تنقید کرنے کے بعد جواب کے بارے میں لکھ دیتے ھیں «و ما اشبه هذا بكلام النائم، والله أعلم بما تكن السرائر» جواب ثالث پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ھیں کہ اس جواب میں عاریت کی اس تعریف کو تسلیم کرلیا گیا ھے جو سائل نے اپنی طرف سے پیش کردی ھے حالانکہ وہ تعریف صحیح بھی نہیں چہ جائیکہ اسے حد قرار دیا جائے «و انه شامل لغير العارية و انه ليس شامل كهذا على مقتضى العرف».

جواب رابع کے بارے میں بتایا ھے کہ تطویل لا طائل ھے اور اس چیز کا ذکر تک غائب ھے جس سے ایسی صورت میں حکم تبدیل ہوتا ھے «وقد علم ان السائل بحث و بقي عليه ما أحدماه من اشتراط العلف في نفس الانتفاع صريحاً أو عرفاً و به تتبدل الحكم والعجب كيف خفي عليهم هذا». قاسم نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیا ھے: «انه لا ضمان على الشريك على مذهب الحنفية والمالكية و الشافعية إذا ذكر العلف بلانزاع و إن لم يذكر و اعتبر العرف فلا ضمان أيضاً ولا ضمان على مذهب الحنابلة ايضاً (بحوالة كتاب الفروع لابن مفلح الحنبلى)».

۱۲۱ــرسالة في انكار القاضي قضاؤه[1]: اگر دو گواہ اس بات کی گواھی دیں کہ قاضی نے فلاں معاملہ میں فلاں شخص کے حق میں اور فلاں کے خلاف فیصلہ دیا ھے اور قاضی اس کے بارے میں کہے کہ میں نے اس طرح کا کوئی فیصلہ نہیں دیا تو اس پر عمل ہوگا یا نہیں اور حکم کا

(۱) فتاوی: ۸۷ تا ۹٦

نفاذ ہوگا یا نہیں ، قاسم نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا. محی الدین الکافیجی جو قاسم کے مشہور حنفی معاصر تھے اور جن سے قاسم سے چشمک رہتی تھی انھوں نے اس پر کچھ اعتراضات کیے . قاسم نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کر کے اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کیا ہے .

۱۲۲—رسالة فی قضاء القاضی (بخلاف مذہبه و بخلاف الكتاب او السنة او الإجماع[1]) : مذاہب اربعہ کے اچھی طرح پھیل جانے اور ان پر عمل عام ہوجانے اور کسی ایک مذہب کی تقلید ضروری سمجھے جانے کے بعد قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا، خصوصاً مملوک دور کے مصر میں جہاں ہر مذہب کے لیے علیحدہ قاضی اور قاضی القضاۃ ہوتے تھے، کہ اگر کسی خاص مذہب فقہی کا قاضی اس مذہب کے خلاف فیصلہ دے دے تو اس فیصلے کی قانونی حیثیت کیا ہوگی اور اس کے نفاذ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے گا یا کسی مجتہد فیہ مسئلہ میں اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ دے تو اس کا نفاذ ہوگا یا نہیں قاسم نے فقہ کی امہات کتب کے تفصیلی حوالوں کے ساتھ اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اس پر جو تفریعات ہوتی ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے .

۱۲۳—إجارة المقاطع التی اقطعها الإمام[2] : شہر غزہ سے ایک سوال اس مضمون کا قاسم کے پاس آیا کہ کیا کسی فوجی کے لیے یہ جائز ہے کہ بیت المال کی زمین، جو حاکم اعلیٰ (الإمام الاعظم) کی طرف سے اسے بطور قطیعہ کے ملی ہے ، اجارے پر اٹھادے یا اس وجہ سے ناجائز ہے کہ اثنائے مدت اجارہ میں امام کسی وقت اسے اس فوجی کے ساتھ سے واپس لے سکتا ہے جس کی وجہ سے اجارے کی پوری مدت کے لیے اس زمین کی مسلسل تسلیم پر اسے قابو نہیں رہتا اور اس وجہ سے بھی

(۱) فتاوی : ۲۲٤ تا ۲۳٦ ؛ فتاوی : ۳۳۸ تا ۳٦۹ .

(۲) کشف : اجارة الاقطاع ؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ کما فی کشف ؛ چسٹر بیٹی : ۳۲۰۲ : اجارات الاقطاع ؛ فتاوی ص ٤۰۸ تا ٤۱۱ .

کہ یہ ملک منفعت ہے اور کسی مال کے عوض میں نہیں ہے. اور اس معاملے میں فوجی کیا اس مستاجر کے مانند ہے جسے خود اجارے پر دینے کا حق ہوتا ہے یا مستعیر کے مانند جسے اجارے پر دینے کا حق نہیں ہوتا. اگر اجارے پر دینا اس صورت میں جائز ہے تو موجر کے مرنے یا امام کے زمین کو اس کے قبضے سے نکال کر دوسرے کو دے دینے سے اجارہ فسخ ہوجائے گا یا نہیں اور اگر فسخ نہیں ہوگا تو اجر مثل کے عوض باقی رہےگا یا اس اجر کے عوض جو موجر اول نے مقرر کیا تھا. قاسم کا جواب یہ تھا کہ اسے اس زمین کو اجارے پر دینے کا حق حاصل ہے. امام کے زمین کو واپس لے سکنے کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑتا اور نہ اس سے کہ اجارے کی مدت کے اندر موجر کا انتقال بھی ہوسکتا ہے اور نہ ملک منفعت ہونے کا. اس کے دلائل اور نظیریں پیش کی ہیں موجر کے مرنے اور امام کے واپس لے لینے سے اجارہ فسخ ہوجائے گا کیونکہ ملکیت غیر الموجر کی طرف منتقل ہوگئی. بعض حنفی فقہاء نے یہ کہا تھا کہ ان دونوں صورتوں میں اجارہ فسخ نہ ہوگا قاسم نے اس کی تردید کی ہے.

۱۲۴—فی مسائل الوقف[1]: وقف کے مختلف مسائل کے بارے میں ہے.

۱۲۵—مایصیر الکافر به مسلماً[2]: ایک سامری کے بارے میں قاسم سے دریافت کیا گیا کہ اس نے برضا و رغبت بلا کسی اکراہ و جبر کے اپنے اختیار سے کلمۂ شہادت پڑھا پھر اس کے بعد اپنے دین پر قائم رہا، حاکم حنفی کے سامنے یہ بات ثابت ہوئی مگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے اوپر جبر کیا گیا تھا اسے اس کے دین پر قائم رہنے دیا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ وہ شخص مسلمان ہوچکا تھا اور بعد میں ارتداد کا مرتکب ہوا. اس مسئلے میں بعض ایسی پیچیدگیاں ہیں جن کے بارے میں قاسم کا کہنا تھا «فقد غلط فيه بعض الاكابر من قضاتها» قاسم نے ان غلطیوں کی

(۱) فتاوی : ۱۸۸ تا ۱۹۲
(۲) فتاوی : ۲٤۱ تا ۲٥٤

نشان دہی کر کے مسئلے کو منقح کیا ہے ۔ قاسم کا کہنا ہے کہ عام طور سے مسلمانوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ کلمۂ شہادت ادا کردینے سے ایک شخص مسلمان ہوجاتا ہے لیکن یہ بات اپنے اندر بعض استثناءات رکھتی ہے ۔ مثلاً یہودیوں کے بعض فرقے ایسے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم علیہ الصوة والسلام رسول خدا ہیں مگر ان کی رسالت صرف عربوں کے ساتھ خاص ہے سارے جہان کے لیے نہیں ہے ۔ قاسم بتاتے ہیں کہ ایسے شخص کو محض کلمۂ شہادت ادا کردینے سے مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔ تا آنکہ وہ حضور کی رسالت عامہ کا قایل ہو اور پچھلی ساری شریعتوں کو شریعت اسلامیہ کا ناسخ، اور ہر ایک کے لیے حضور کے لائے ہوئے پیغام کی پیروی کو ضروری سمجھتا ہو ۔

۱۲۶۔فتوی فی شخص بیدہ حصة من عقار ثبت ملکه لهاسنة ۸۵۱ھ وادعی آخر انها له بحجة من ۸۴۷ھ[1] : محمد بن سلیمان الکافیجی الحنفی نے یہ فتوی دیا تھا کہ کیوں کہ دعوی کی بینہ ملکیت کے حکم کی دلیل سے متاخر ہے اس لیے متاخر ناسخ ہوگی اور یہ بھی بتایا کہ اس سے نقض حکم لازم نہیں آتا ۔ قاسم کے پاس بھی یہ فتوی تصدیق کے لیے آیا تھا ۔ قاسم نے اس جواب پر سخت اعتراض کیے اور کہا کہ فتوی عدم مراجعت کتب فقهیه کی وجہ سے سراسر غلط ہے ۔ مجیب نے سائل کے صحیفے کو دنیا میں اور اپنے صحیفے کو آخرت میں سیاہ کیا ہے ۔ پھر مسئلے کی تحقیق کی ہے اور «مختصر» الحاکم الشهید اور «محیط» کے حوالوں سے اپنے موقف کو مدلل کیا ہے ۔ بالکل اسی طرح کا ایک فتوی یحیی بن محمد الاقصرائی الحنفی نے دیا تھا اور بتایا تھا کہ بینة واضع الید پر عمل کیا جائےگا نہ کہ «بینة من بیده کتاب الملک» پر ۔ قاسم نے اس پر اعتراض کیا اور بتایا کہ اس کے برخلاف صحیح ہے ۔ کافیجی پر اعتراض کرتے ہوئے قاسم نے قاضی خاں کے حوالے سے بتایا کہ رسم المفتی یعنی فتوی دینے کا اصول و دستور یہ ہے کہ اگر مسئله مسئول عنها ظاهر الروایات میں سے

(۱) مجموعه : ۴۰ ب تا ۴۲ الف

ہے اور اصحاب میں اس کے بارے میں اختلاف نہیں تو مفتی اگر مجتہد متفنن بھی ہے تب بھی ظاہر الروایات کے مطابق فتوی دے ۔ قاسم کا بجا طور پر کہنا ہے کہ سائل تمہاری ذاتی رائے نہیں پوچھتا وہ امام ابو حنیفہ اور اُن کے اصحاب کی رائے معلوم کرتا ہے ۔ اسی کے مطابق جواب دو ۔

۱۲۷ــرسالة فی الطلاق الرجعی[1] : ایک عورت کو طلاق رجعی دی گئی اور اس پر تین ماہ تیرہ دن گزر گئے اور شوہر کا انتقال ہوگیا ۔ عورت نے اقرار کیا کہ اس دوران اسے تین حیض آچکے ہیں اور اس کی عدت شوہر کی موت سے پانچ دن پہلے ختم ہوگئی ۔ مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اس اقرار کے بعد اسے وراثت ملے گی یا نہیں ۔ اس صورت میں کسی مفتی نے عبداللطیف بن فرشتہ کی «شرح مجمع البحرین» کے حوالے سے بتایا تھا کہ اسے وراثت ملے گی ۔ قاسم نے بتایا غلط ہے اسے وراثت نہیں ملے گی ۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو کرحی الفتاوی الصغری لحسام الدین ، التتمة ، المنية ، قاضی خان ، شرح ہدایہ ، شرح کنز ، المحیط ، البدایع ، الذخیرہ ، اور فصول عمادیہ کے حوالوں سے قاسم نے اپنے جواب کو مدلل کیا ۔

۱۲۸ــتعلیق الطلاق بالنکاح[2] : حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت سے کہے کہ اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے یا جس عورت سے نکاح کروں اس کو طلاق ، تو نکاح کے فوراً بعد طلاق واقع ہوگی ۔ قاسم نے اس مسئلے کی تشریح کی ہے ۔ ائمہ مذہ کے جو اختلافات ہیں ان کی تفصیل کی ہے اور اخبار و آثار جن سے وہ استدلال کرتے ہیں ، پیش کیے ہیں ۔ مذکورہ بالا صورت میں نکاح کی وہ صورت جس میں طلاق واقع نہ ہو کیا ہوسکتی ہے یہ بھی

(۱) مجموعہ : ٤٢ ب تا ٤٤ الف : رسائل ص ۲۱ تا ۲٤ ؛ فتاوی ص ۳۹۰، تا ۳۹٤، ص ۹٦ تا ۱۰۰ ، یہاں اس کا نام حاشیہ میں «فی العدة وطلاق المریض» دیا ہوا ہے ۔

(۲) فتاوی ص ۳٦۹ تا ۳۹۰؛ رسائل ص ٤۰ تا ٦۰ ؛ مجموعہ ص٤٧ ب تا ٥٢ الف .

بتایا ہے قضا اور فتوی میں ائمۂ ثلاثہ کے نردیک کیا فرق ہے اور وہ ان دونوں کی حقیقت کیا قرار دیتے ہیں اس پر بھی گفتگو کی ہے۔

۱۲۹ــمسئلۂ لبس الأحمر[1] : سرخ رنگ کا کپڑا پہننا مردوں کو جائز ہے یا مکروہ ہے۔ مکروہ ہے تو تحریمی یا تنزیہی مکروہ ہونے کی صورت میں نماز درست ہوگی یا نہیں۔ قاسم نے احادیث و آثار کی روشنی میں ان مسائل پر گفتگو کی ہے اور دلائل پیش کیے ہیں۔ قاسم کا مسلک اس بارے میں یہ ہے «مکروہ تحریماً تصح الصلوة مع الکراهة»۔

۱۳۰ــردالقول الخائب فی القضاء علی الغائب[2]: کسی حنفی فقیہ نے قاسم کے سامنے یہ بات کہی کہ آج کل اگر کوئی حنفی قاضی کسی کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف فیصلہ دے دیتا ہے تو وہ نافذ ہوگا۔ قاسم نے کہا اس دعوے کی صحت ہمیں تسلیم نہیں۔ اس فقیہ نے کہا تمہاری بات ایک روایت کے مطابق ہے اور اصح الروایتین کے موافق نفاذ ہوگا اور اس کے بعد «هدایه» اور استروشنی کی «فصول» کے حوالے سے بتایا کہ یہ معاملہ مجتہدیہ ہے۔ مزید برآں اپنے دعوے پر «شارح هدایه قوام الدین الاتقانی عن الحاکم الشهید، خلاصة الفتاوی عن الامام السرخسی، الزیادات، جامع الفتاوی، الفتاوی الظهیریة، الفصول عن المحیط والصغری کو ثبوت میں پیش کیا۔ قاسم نے اس پر کہا کہ «هذه کلام من لم یحصل علم المسئلة، و لا علم مراد الاصحاب بالقاضی، ولا مدلولات الفاظهم، ولا محل نزاع» وجہ یہ بتائی کہ اس مسئلہ میں دو اختلافات ہیں: ایک وہ اختلاف جو ائمۂ مجتہدین کے درمیان ہے، اور دوسرا وہ جو مشائخ احناف کے درمیان ہے۔ وہ اختلاف جو ائمہ کے درمیان ہے وہ اس کے جواز کے بارے

(۱) رسائل ص ۹۵ تا ۹۹۔

(۲) رسائل ص ۱۱۹ تا ۱۲۲؛ کشف ۸۳۷؛ اسماء ۱: ۸۳۰؛ سراج الدین عمر بن رسلان الشافعی البلقینی (م ۸۰۵ھ) کی ایک کتاب اسی مسئلہ پر بنام «القول الصائب فی جواز القضاء علی الغائب» ہے۔ کشف ۱۳۶۴

میں ہے۔ ہمارے ائمہ کا قول یہ ہے کہ قضاء علی الغائب جب قصداً ہو باطل ہے۔ دوسروں نے اسے جائز بتایا ہے۔ اس پر یہ اختلاف متفرع ہوتا ہے کہ وہ قاضی مجتہد جسے قضا کی ذمہ داری بغیر کسی پابندی کے (مطلقاً) سونپی گئی ہو وہ اپنے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے قضاء الغائب پر عمل کرتا ہے تو جائز ہے۔ مشائخ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ غائب پر قضاء کے نفاذ کے بارے میں ہے بشرطیکہ قضا اجتہاد سے صادر ہوئی ہو۔ بعض کا قول ہے کہ یہ قضاء محل اجتہاد میں ہونے کی وجہ سے نافذ ہوگی اور بعض کہتے ہیں نافذ نہ ہوگی اس کا نفاذ دوسرے قاضی کے امضاء پر منحصر ہے۔ روایتیں سے مراد یہی اختلاف ہے اور یہ مشائخ کا معروف استعمال ہے کہ «قاضی» بول کر «مجتہد» مراد لیتے ہیں اور «فقیہ» سے بھی۔ اس سب کی دلیل یہ ہے کہ «الاصل» میں امام محمد نے القضاء علی الغائب کو بغیر کسی اختلاف کے ناجائز بتایا ہے۔ قاسم نے شرح طحاوی، هدایه، ادب القاضی، اتقانی عن الحاکم الشہید کی عبارتیں پیش کر کے ثابت کیا کہ قاضی سے مطلب مجتہد ہے۔ مشایخ کا اختلاف «الفصولین» میں مصرح ملتا ہے کہ قضاء علی الغائب کے نفاذ میں دو روایتیں ہیں۔ شمس الائمہ سرخسی اور شیخ الاسلام خواہر زادہ نفاذ کے حق میں ہیں۔ ان کے علاوہ مشائخ عدم نفاذ کے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ روایتیں کا اطلاق اختلاف مشایخ پر ہوتا ہے۔ پھر تفصیل سے نفاذ کی وجہ بتائی ہے۔

۱۳۹ــرفع الاشتباہ عن مسئلة المیاہ[1]: پانی کے مسائل پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مفصل گفتگو کی ہے: الفصل الاول فی تعریف المیاہ المستعمل و فیما یصیر به الماء مستعملا و ما لا یصیر به مستعملا؛ الفصل الثانی فی حکم المیاہ المستعمل و متی یصیر مستعملاً؛ الخاتمة فی بیان حکم ملاقاة الماء الطاہر للماء الطہور.

(۱) کشف : ۹۰۹ «مسیل المیاہ»؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ «مسیل المیاہ» ؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹)؛ مجموعه صو ۴۹ الف.

۱۳۲ــقضاء الفوائت[1] : قضاء نمازوں کی ادائیگی اور ترتیب پر ہے، «ہدایہ» کی عبارت کی تشریح کے سلسلے میں ۔

۱۳۳ــکتاب فتوی فی وقف البنا دون الارض و فی الرهن اذا ضاع من المرتهن[2] : اس وقف کے سلسلے میں قضاء القاضی بخلاف مذہبہ پر نہایت مفصل بحث ملتی ہے ۔

۱۳٤ــرسالة فی مسئلة الإستبدال[3] : فتوی عن رجل استبدل أرضاً لمقدار معلوم بطریق الوکالة و وضع المستبدل له یده علیه و هدمه و انشأ فیه واستمر علی ذلک مدة ثم مات المؤکل ثم الوکیل و أراد المستبدل منه الرجوع بالمبلغ المستبدل به .

۱۳۵ــالعصمة عن الخطأ فی نقض القسمة[4] .

۱۳٦ــموجبات الاحکام فی الفروع[5] : ایسی مرہونہ جائداد کی فقہی حیثیت کے بارے میں ہے جیسے راہن نے بعد میں وقف کردیا اور دونوں مرحلوں میں سے پہلے پر حنبلی قاضی نے اور دوسرے پر حنفی قاضی نے فیصلہ دیا ۔

۱۳۷ــدفع المضرات عن الأوقاف و الخیرات[6] .

۱۳۸ــاعمال فی الوصایا و الدوریات و احراج المجهولات[7] .

(۱) ذخیرۂ فرنگی محل ، مخطوطه رقم ۳۳۵ : ٤۳، ص ۲۰۳ ب ؛ فتاوی ص ٤۳٦ .

(۲) فتاوی ص ۲۵٤ تا ۲٦٦ ؛ مجموعه ص ٦ ناقص الآخر .

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷ (تخریج الأقوال فی مسئلة الإستبدال)؛ رسائل ص ۷۰ تا ۷۲ ؛ مجموعه ۵۵ (الف) .

(٤) کشف : ۱۱٤۱؛ اسماء ۱ : ۸۳۱ ؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹) ؛ مجموعه : ۵٦ (الف) .

(۵) اسماء ۱ : ۸۳٦ ؛ (مغنیات الاحکام) بروکلمن ۲ : ۸۱ ، (۹۹) کشف : ۱۸۹۸ رسالے کی نوعیت کشف سے ماخوذ ہے ۔

(٦) کشف ۷۵۷ ؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ . دیکھیے اجارة الوقف

(۷) الضوء ٦ : ۱۸۷

۱۳۹ــالجدات فی السہو عن السجدات[1] .

۱٤۰ــرفع الیدین[2] .

۱٤۱ــشرح السملة[3] .

۱٤۲ــرسالة فی المساقاة[4] : مساقاۃ کے مسئلے پر قاسم اور دوسرے فقہاء کے جوابات اور قاسم کی تحقیقات مسئلہ مذکورہ کے بارے میں .

۱٤۳ــالقمقمة فی مسئلة الجرہ و القمقمہ[5]

۱٤٤ــحفر المرمات[6] : ایک شخص نے کچھ مزدور رکھے اور قد آدم سے دوگنے گہرے گڑھے کھدوائے . ایک گڑھے کی دیوار کسی مزدور پر گرپڑی جس سے وہ ہلاک ہوگیا. مسئلہ یہ تھا کہ اس مزدور کی دیت کسی پر آتی ہے یا کسی پر نہیں، آتی ہے تو کس پر ، مالک پر یا ساتھی مزدوروں پر . اس کی مفصل تحقیق ہے

۱٤٥ــفی حکم مؤخر الصداق[7] : حنفی قاضی نے مہر مؤجل کو موت یا طلاق تک مؤخر کردیا اور نجم الدین الزاہدی کے اس قول سے کہ خوارزم میں موت یا طلاق تک مہر کو موخر کرنا ان کے نزدیک عادت مالوفہ اور شریعت معروفہ ہے اور فخر الدین زیلعی کے اس قول سے استناد کیا کہ « لیس لھما إن تعورف تاخیرہ الی المیسرة او الی الموت او الطلاق ولو کان حالا لان « المتعارف کالمشروط » قاسم نے بتایا کہ ان دونوں سے سند نہیں پکڑی جاسکتی کیونکہ خوارزم کا عرف مصر و شام کے عرف سے مختلف ہے اور دوسرے قرب و جوار کے اسلامی ممالک کا بھی . اور اپنے مسلک کی وضاحت کی .

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ کشف ۱۹۳۰ (فی بیان السہو) ؛ اسماء ۱ : ۸۳۱ ، کما فی کشف .

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷ والسملة : اسماء ۱ : ۸۳۰

(٤) فتاوی ص ٤۰۸ تا ٤۱۱ . (٥) اسماء ۱ : ۸۳۱

(٦) فتاوی ص ٤۰٥ تا ٤۰۸

(۷) فتاوی ص ۲۰۷ تا ۲۰۹ ؛ رسائل ص ۱۱۸

قاسم کے کام کی قدروقیمت :

قاسم کی تصنیفات و تالیفات کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگرچہ قاسم کی نظر سارے ہی متداول علوم و فنون پر تھی تاہم ان کا اصل میدان حدیث اور فقہ کا ہے ۔ حدیث میں قاسم کی مہارت کا اندازہ ان کی تخریجات ، رجال پر ان کی تالیفات اور شروح وغیرہ سے بخوبی ہوسکتا ہے ۔ تخریج کے فن میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث پر نظر ہو ۔ قاسم نے تخریج کو نہ صرف اپنا موضوع بنایا بلکہ اس فن کے ائمہ کی جو تالیفات اس موضوع پر تھیں ان پر استدراکات اور اضافے بھی کیے ۔ زیلعی اور عراقی فن حدیث میں بڑے وسیع النظر ائمہ میں سے ہیں ان کی تخریجات پر استدراک ہر مدعی حدیث کا کام نہیں ، رجال زوائد اور امام محمد و طحاوی کی تصانیف اور امام ابو حنیفہ و شافعی کی مسانید کے رواۃ کی جمع و ترتیب خود فن رجال کے وسیع مطالعے کو متقاضی ہے ۔ حدیث پر قاسم کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد ابن حجر کے فیض صحبت سے فن حدیث کا اچھا ذوق پیدا کرلیا تھا جسے ان کے وسیع مطالعے نے بڑی گیرائی بخشی تھی ۔ بعض کوتاہ نظروں نے حنفیہ پر علم حدیث کی کمی کا جو الزام لگا رکھا ہے قاسم کی ذات اس کی مجسم اور مؤثر تردید تھی ۔ قاسم کی نظر حدیث کے صرف روایتی پہلو پر ہی نہ تھی وہ احادیث سے مسائل کے استنباط واستخراج کے رموز سے بھی آشنا تھے ۔ امام ابو حنیفہ پر اجلۂ محدثین کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کو دفع کرنا اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو حدیث کے روایتی پہلو رجال ، اسانید اور علل حدیث پر پوری نظر رکھتا ہو ، مختلف اور متعارض حدیثوں میں تطبیق و توفیق کے فن سے واقف ہو ، ساتھ ہی موضوع سے متعلق احادیث کے مرکزی خیال کو دریافت کرتے ہوئے استقراء کے ذریعے اُن اصول و استثناءات پر پہنچ سکے جو ان کی تہ میں کام کررہے تھے اور اس طرح فقہی مسائل کو پراگندہ اور منتشر افراد کی صورت میں

دیکھنے کے بجائے ایک مربوط اور باقاعدہ نظام کی شکل میں دیکھ سکتا ھو۔ اس میں شک نہیں کہ قاسم اس اعتبار سے فن حدیث پر بڑی اچھی نظر رکھتے ھیں ۔ انھوں نے محدثین سے خود ان کے میدان میں انھیں کے ھتھیاروں سے مقابلہ کرکے حدیث کے میدان میں امام ابو حنیفہ کی برتری ثابت کی ھے ۔

حدیث کا اصل مقصد یہ ھے کہ انسان کو ابتدائی زندگی میں عقائد اور عمل کے اعتبار سے تفصیلی ھدایت مل سکے ۔ یہ چیز ھمیں فقہ کی طرف متوجہ کرتی ھے جس کی حقیقت انسانی زندگی کے لیے تفصیلی اور عملی رھنمائی کی فراھمی ھے ۔ قاسم کا اصل میدان اور حقیقی کام فقہ ھی ھے ۔ وہ اس میدان کے مانے ھوئے شہسواروں میں سے ھیں۔ متاخرین حنفیہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ خاص کر ابن الھمام نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ دکھایا کہ فقہ حنفی پر یہ الزام درست نہیں کہ یہ احادیث وآثار سے زیادہ قیاس وغیرہ پر اعتماد کرتا ھے ۔ انھوں نے یہ بتا دیا کہ فقہ حنفی حدیث کے صحیح اور کلی فہم کا براہ راست نتیجہ ھے اور اس طرح فقہ اور حدیث کو دو متخالف رجحانات سمجھنے کے خلاف احتجاج کیا اور ان دونوں دھاروں کو ایک دوسرے میں سمونے کی کوشش کی ۔ قاسم اس معاملے میں اپنے استاد ابن الھمام کے سچے جانشین ھیں ۔ قاسم نے ابن الھمام کی کوششوں کو آگے بڑھایا ۔ انھیں اس کوشش میں جو کامیابی ھوئی اس کا اعتراف مخالف و موافق دونوں کو ھے ۔ قاسم کی فقہی تحقیقات ان کی ان کوششوں اور کامیابی کا بڑا واضح ثبوت پیش کرتی ھیں ۔ قاسم جب کسی فقہی مسئلے پر گفتگو کرتے ھیں تو اس سے متعلق احادیث و آثار اور روایات کے سارے ذخیرے کو پیش کرکے دکھا دیتے ھیں کہ استنباط مسائل میں حنفی مسلک دوسرے مسالک کے مقابلے میں جو توافق حدیث کا دعوی رکھتے ھیں احادیث سے کہیں زیادہ مطابقت و مناسبت رکھنے والا ھے ۔

فقیہ اس وقت تک فقیہ کہلانے کا مستحق نہیں جب تک اسے مسائل

کے بارے میں نہ صرف صحابہ کے اختلافی مسائل، مجتہدین کے اختلافات ان کا مبنی، منشا اور دلائل کا علم ہو بلکہ ساتھ ہی ہر فقہی مذہب کے اصل اور بنیادی مسائل (جسے اصل مذہب کا نام دیا جاتا ہے)، اصحاب مذاہب کے مسائل کی تخریجات، تنقیحات اور تفریعات سے بھی پورے طور پر باخبر ہو۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جہاں تک ان کے معاصرین کا تعلق ہے۔ بلکہ غلط نہ ہوگا اگر معاصرین کے بجائے متأخرین حنفیہ کہا جائے۔ قاسم اس بارے میں ایک امتیازی شان کے مالک نظر آتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو فقہ حنفی کے محقق ہیں اور اس کے اصول و کلیات تفریعات و تخریجات اور اصل مذہب سے باخبر، ساتھ ہی متقدمین و متاخرین کی تصانیف پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ان کے طرز تعبیر کے ادا شناش اور ان کی تحقیقات اور کام سے واقف ہیں بلکہ صحابہ کے اختلافی مسائل اور ان کے دلائل کے علم کے ساتھ باقی مذاہب فقہیۂ ثلاثہ کے مسائل و دلائل پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات دوسرے مذاہب کے اپنے معاصرین سے زیادہ ان کے مسائل اور مذاہب سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ قاسم نے دوسرے مذاہب کا ایسا مطالعہ کیا تھا کہ ان پر تنقید بھی کرسکتے تھے انہوں نے جن دیگر مذاہب کے علماء پر ان کے مذہب کے مسائل کے بارے میں گرفت کی ہے وہ ایک دقیق و عمیق مطالعے کا پتا دیتی ہے۔

قاسم تاریخ فقہ کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب تحقیقی تقلید کی بنیاد پڑ رہی تھی اور فقہی مسائل کو تحقیق کی کسوٹی پر کسا جا رہا تھا۔ قاسم اس دور کے اس رجحان کے بڑے اچھے مظہر ہیں، وہ مقلد ہوتے ہوئے بھی محقق ہیں اور امام ابو حنیفہ کی تقلید پر علی وجہ البصیرت قائم ہیں۔ وہ احادیث و آثار کی روشنی میں فقہ حنفی کے مسائل کو مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس بات کے سخت مخالف ہیں کہ کوئی مفتی یا فقیہ مستفتی کو اپنی ذاتی رائے سے مسائل بتایا کرے۔

قاسم کے فتاویٰ نے جہاں ایک طرف اس دور کی زندگی کی

جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کن باتوں کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے اور اپنے قانونی برتاؤ کا رشتہ عملی زندگی سے کس طرح جوڑتے تھے اور کن باتوں کی ان کی نگاہوں میں اہمیت تھی وہاں خود قاسم کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ فیاض ازل نے انہیں ایک قانونی اور نکتہ رس دماغ بخشا تھا جسے ترتیب اور مطالعے نے جلا دی تھی وہ مسئلہ زیر بحث کے بنیادی نکات کو فوراً گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس اصول کی تحقیق و تنقیح کرتے ہیں جو اس کا مدارعلیہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں وزن اور جان محسوس ہوتی ہے ۔

ابن الہمام اگرچہ فقہ حنفی کے پابند ہیں مگر عصبیت کا شکار نہیں ۔ تحقیقی ذوق و رجحان نے انہیں عالی ظرفی اور بلند حوصلگی بخشی تھی ، وہ مخالف کی دلیل کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اگر معقول اور یقین بخش ہو تو اسے حراج دلی سے تسلیم بھی کرتے ہیں ۔ قاسم نے اپنے استاد سے یہ حراج دلی ، عالی ظرفی اور بلند حوصلگی بھی سیکھی تھی ۔ وہ علمی میدان میں اپنے مخالف کی خوبیوں کا اعتراف کرنے سے گریز نہیں کرتے ۔ وہ خود ابن عربی اور ابن الفارض کے عقیدت‌مند ہیں مگر ان حضرات کے سخت ترین ناقد ابن تیمیہ سے علمی استفادے میں عار نہیں محسوس کرتے اور ابن تیمیہ کو علوم شرعیہ میں ان کا مقام دیتے ہیں ، یہ دوسری بات ہے کہ وہ ابن تیمیہ کو تصوف کا ذوق شناس نہیں سمجھتے اور اس بارے میں ان کے زیادہ قایل نہیں ۔ یہ دلیل ہے قاسم کے علم سے خلوص رکھنے اور برتنے کی ۔

مختصراً ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قاسم فقہ اور حدیث کا ایک سنگم تھے ان کی ذات میں محدث ابن حجر کا پرتو اور فقیہ ابن الہمام کا جلوہ نظر آتا ہے ۔ علم کی چاکری نے اس مملوک کو وہ رتبہ بخشا کہ وہ نہ صرف اپنی برادری کے لیے باعث فخر و نازش ہیں بلکہ کتنے ہی سر ان کے علم و فضل کے احترام میں خم ہیں ۔

[۶۴ / ۱۱ / ۲۵]

نوائی کے ترکی اشعار

میر علی شیر نوائی (۸٤٤ھ / ۱-۱٤٤۰م — ۹۰٦ھ / ۱۵۰۱م) کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک مدبر، مصنف، مصور، اور ماہر موسیقی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس نے ترکی اور فارسی[۱] دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے اور بقول پروفیسر براؤن جملہ فن و ادب کی سرپرستی نے اسے ادب ایران کی ہر تاریخ میں تحسین آمیز ذکر کا حقدار بنا دیا ہے[۲]۔ تاہم میر علی شیر نوائی کی ادبی ناموری کا استحقاق ترکی زبان پر مبنی ہے[۳]۔ اس نے ترکی زبان کی شرقی بولی میں شاعری کی ہے جس کو چغتائی (چاغاتائی) بھی کہا جاتا ہے[٤]۔ لیکن اس سے کسی طرح سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ میر علی شیر نوائی نے جنوبی

---

(۱) وہ فارسی میں «فانی» تخلص کرتا تھا۔

(۲) E. G. Brown : *A Literary History of Persia*, Vol. III, p 506

(۳) میر علی شیرنوائی کے حالات زندگی اور اس کے آثار کے لیے پروفیسر احمد ذکی ولیدی طوغان کا مضمون دیکھیے جو ترکی دائرہ معارف اسلامیہ (Islam Ansiklopedisi) کی چوتھی جلد میں شائع ہوا ہے۔ نیز اسی موضوع پر دیکھیے: -

(1) A. Samoylovich : *Mir Ali Shir* (Leningrad, 1928); (2) Belin : *Notice biographique et litteraire sur Mir Ali-Chir-Nevali* (Journal Asiatique, Vol. 17); (3) A. A. Semenov : *Materyali bibliograficheskomu ukazatelu pechatnih proizvedeniy Alishira Novyi littraature onem* (Tashkend, 1940); (4) Ali Nihad Tarlan : *Ali Shir Nevayi* (Istanbul, 1942); (5)—

دیوان امیر نظام الدین علیشیر نوائی فانی : رکن الدین همایون فرخ.
(تهران - ۱۳٤۲ شمسی)

(٤) وسط ایشیا کی چغتائی سلطنت کے اندر تیموریوں کے عہد میں ترکی ادب کے درخشاں ارتقا کے زیر اثر مشرقی ترکی ادبی زبان کا نام چغتائی پڑگیا ہے جو ترکی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ترکوں کی عثمانی ترکی شاعری کی نشو و نما پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہندستان میں تیموری سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ بڑی دقت نظر کا مالک تھا اور عام تذکرہ نگاروں کی طرح جا و بیجا ستائش کرنے کا بہت کم عادی۔ اس کے باوجود میر علی شیر نوائی کی شاعری کی تعریف اس نے «بابر نامہ» میں نہایت اعلی الفاظ میں کی ہے[1]۔

میر علی شیر نوائی فارسی زبان کا بھی عالم تھا اور فارسی ادب سے کافی متاثر۔ چنانچہ دوسرے ترکی شعراء کی طرح وہ بھی فارسی شعراء کا مقلد نظر آتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے مثالی نمونوں کی کبھی اندھی تقلید نہیں کی ہے۔ بظاہر اس کے اشعار اس کے زمانے اور ہم وطنوں کے مذاق کے عین مطابق تھے اور انھیں موجودہ زمانے تک بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کی آخری تصنیف «محاکمۃ اللغتین» جو دسمبر ۱۴۹۹م (جمادی الاولی ۹۰۵ھ) میں مکمل ہوئی تھی، اہم کتاب ہے۔ اس میں ترکوں اور ایرانیوں کی زبان اور ثقافت کا باہمی مقابلہ کیا گیا ہے اور مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شعرگوئی کے لیے اور عام طور پر معنوی مقاصد کے لیے ترکی زبان فارسی سے کم موزوں نہیں ہے[2]۔

میرعلی شیر نوائی نظم و نثر دونوں میں ایک سی امتیازی شان رکھتا ہے۔ موسیو بیلین[3] نے اس کی کل تصانیف کی تعداد ۲۹ اور رکن‌الدین همایون فرخ[4] نے ۳۲ شمار کرائی ہیں[5]۔ لیکن ان کی بتائی ہوئی کتابیں

(۱) *The Babar nama*, ed. Annethe Beveridge (London, 1905), p. 40

(۲) *The Encyclopadia* of Islam Vol. IV, p. 916 ؛ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاهور، ۱۹۶۲م) ٤ : ۲۵۲

(۳) *Journal Asiatique*, Vol 17, p. 194

(۴) دیوان امیر نظام الدین علیشیر نوائی فانی (تهران ۱۳۴۲ شمسی) مقدمہ چہاردہ و پانزدہ۔

(۵) راقم الحروف کو میرعلی شیرنوائی کی چند تصانیف کے ایسے قلمی نسخوں کا پتا چلا ہے جن کا ان حضرات نے ذکر نہیں کیا ہے۔

اب نایاب یا کمیاب ہوگئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض تذکروں اور مختلف بیاضوں میں میر علی شیرنوائی کے ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس کے مطبوعہ آثار سے خارج ہیں۔ اس مضمون میں ایسی ہی ایک قدیم قلمی بیاض سے جو ڈاکٹر نذیر احمد کے خیال کے مطابق ۹۶۳ اور ۹۸۰ کے درمیان مرتب ہوئی ہے، میرعلی شیر نوائی کا کچھ کلام مع اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

یہ بیاض علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے اور اس کا نمبر ۵۰/۹۲ ہے۔ اس بیاض میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا کلام درج ہے جن میں ترک سلاطین؛ امرائے ہندستان اور ایران کے معاصر اور دوسرے بادشاہوں کے علاوہ وسط ایشیا کے بھی شعراء شامل ہیں۔

ترکچہ شعرلری

۱ بیزنینک ایمن یول اوزکا ساری قالمیش
بو ساری بیزنی دریا موجی سالمیش

۲ زلفونک گرهیغه پای بست اولمیش مین
لعلینک میدین باده پرست اولمیش مین

۳ اول مینی ایچیب یولونکدا پست اولمیش مین
میمی نی دیدم مگرکه مست اولمیش مین

۴ کوب آتشگاه اوتیدین تابمیشام داغ
که تاجمع ایلامیش مین بو قدر یاغ

۵ قایوسی و ادیکیم اشک سیلی سورمامیش
قایوسی تاغ اوجیغه کیم موجی باشمه اورمامیش

۶ استاما سانک ایلاما سانک بیزنی
مین اوپارام یولونک اوزرا ایزنی

۷ لعل لبینک که جانیم ایرور مبتلا انکا
مخلص دیمان که ایستارام اولغای فدا انکا

۸ زلف و قدینک فرقتیدین نیچه قیلسام کشت باغ
اوکا آلمان چمن‌نینک سنبل و شمشاد بدین

۹ بوز محنت و غم کونکلومه یتکوردی فراق
جانیمغه بلا و درد اوقین اوردی فراق
۱۰ بیرگل غمیدین قوبای دیدم باغریمه داغ
بیر کاییوسیان عطری دماغیمغه فراق

۱۱ سرّ عشقینکنی دی آلمان بازاهم آلمان کیم
تیلی ابکی قلم و کونکلی قرا کیلدی دوات

۱۲ توروب معرضدا سوز حدّیمنی بیلمان
جواب ایتورغه اوز حدّیمنی بیلمان
۱۳ ولی کیلتورما کیگا چاره بیلمان
بوعجزیمدین ایشکا باره بیلمان

۱٤ ای صبا آواره کونکلم استایو هریان بارو
وادی و تاغ و بیابانلارنی بربر آختارو
۱۵ آلداکیل کر بولسه مجنون شیوه و بی‌اختیار
قویماپین اوز اختیاریغه بو ساری باشقارو

۱٦ مونکا تکرو که حالا ساغ ایمیش دوک
پری که دشت و کاهی تاغ ایمیش دوک

۱۷ دیدیلار سین چغتای ایلی سین
اوشبو پیردا چغتای خیلی سین

۱۸ نیدیب اوزبک بیله یساور بولدونک
خانقه بوینکلیغ جاکر بولدونک
۱۹ مین دیدیم سیزکه جوابیم اوقتور
بوندین اوزکا بسه سوزیم یوق تور

اردو ترجمہ

۱۔ہمارے لیے امن و سلامتی کا راستہ دوسری طرف ہے . اس طرف تو ہمارے لیے دریا کی حطرناک موجیں ہی ہیں .

۲۔۳۔میں تیری زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا ہوں . تیری شراب لب لعل کا مےحوار بن گیا ہوں . یہ شراب پی کر ہر کوچہ و بازار میں لڑکھڑاتا اور گرتا پڑتا ہوں . ہائے ! یہ میں نے کیا کہہ دیا . شاید میں بہت زیادہ مست اور مدہوش ہوگیا ہوں .

٤۔(حسن کے) کتنے ہی آتش کدوں کی آگ سے میں جل کر زخمی ہوگیا . اسی لیے تو اس قدر مرحم میرے جسم پر جمع ہوگیا ہے

۵۔(فراق میں روتے ہوئے کہتا ہے) اشکوں کا یہ سیلاب کس وادی سے چلا آرہا ہے کہ مجھے غرق کیے دیتا ہے . اب میں کس پہاڑ پر جاؤں کہ اس کی موجیں مجھے غرقاب نہ کردیں

٦۔تو مجھے نہیں چاہتا . میری طرف کوئی توجہ نہیں دیتا ! میں تیری راہ کے نشان قدم پر پھر بھی اپنے بوسے نثار کرتا ہوں .

۷۔میرا دل تیرے لب لعل کا اسیر ہے اور اس دام سے رہائی نہیں چاہتا . وہ تو خود اس کا والہ و شیدا ہے .

۸۔تیرے زلف و قد کے ہمسر کی تلاش میں میں نے کتنے ہی چمنستان چھان ڈالے مگر کوئی ان جیسا نہ ملا . سنبل و شمشاد بھی میرے معیار پر پورے نہ اترے .

۹۔۱۰۔تیری فرقت میرے دل کے لیے لاتعداد رنج و الم کا باعث ہے . اس فراق نے میری زندگی پر درد و غم کے تیر برسائے ہیں . میں

پھر بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ غم کا کوہِ گراں میرے لیے ایک گلاب کا پھول ہے جس کی خوشبو سے میرا مشامِ جان معطر ہے۔

۱۱—عشق کے رازِ درون پردہ سے تمھیں کیسے مطلع کروں۔ قلم میری صحیح ترجمانی نہیں کرتا کیونکہ میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ کچھ لکھتا ہے اور دوات کا بھی دل سیاہ ہے۔

۱۲-۱۳—تجھ سے آمنے سامنے بات کرنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا ہوں کیونکہ تیرے سوال کا جواب دیتے وقت میں عالم خود فراموشی میں پہونچ جاتا ہوں۔ اس کا درماں بھی میرے پاس نہیں۔ اسی لیے میں گوشہ نشین ہوگیا ہوں کہ کہیں تم سے گفتگو نہ ہوجائے۔

۱۴-۱۵—اے بہار! میرے آوارہ دل کی تلاش میں ہر طرف جا۔ وادی، پہاڑ، بیابان ہر جگہ اس کو تلاش کر۔ وہ عشق میں مجنون بن گیا ہے اور کہیں کھوگیا ہے۔ اس کو اس کے حال پر نہ چھوڑ۔ اس کو میرے پاس لے آ۔

۱۶—اس کی زندگی ریگستان کی طرح خشک و بے کیف اور پہاڑ کی طرح دشوار گزار ہوگئی۔ پھر بھی وہ زندہ ہے۔

۱۷-۱۹—کہنے لگے کہ تم چغتائی ہو۔ اور چغتائی فوج سے تعلق رکھتے ہو۔ پھر کہا کہ تم ازبکوں کے دوست ہوگئے ہو اور بادشاہ کے خیرخواہ ہو۔ اس پر میں نے صرف یہ کہا کہ اس کے علاوہ تمھارے پاس میرے لیے کوئی دوسرے الفاظ نہیں ہیں۔

علی گڑھ — ڈاکٹر اکمل ایوبی

* *

مجلۂ علوم اسلامیہ

مرتبہ

ڈاکٹر مختار الدین احمد

جلد اول نمبر ۱ ۱۹۶۰ ۵ روپے	جلد سوم نمبر ۱ ۱۹۶۲ ۵ روپے
جلد اول نمبر ۲ ۱۹۶۰ ۵ روپے	جلد سوم نمبر ۲ ۱۹۶۲ ۵ روپے
جلد دوم نمبر ۱ ۱۹۶۱ ۵ روپے	جلد چهارم نمبر ۱ ۱۹۶۳ ۵ روپے
جلد دوم نمبر ۲ ۱۹۶۱ ۵ روپے	جلد چهارم نمبر ۲ ۱۹۶۳ ۵ روپے

جلد پنجم نمبر ۱، ۲ ۱۹۶٤ ۱۰ روپے

مطبوعات شعبۂ عربی و اسلامیات

البیان فی إعجاز القرآن للخطابی — ۲ روپے

تحقیق و تحشیہ : ڈاکٹر عبد العلیم

وصف الهند و ما یجاورها من البلاد للإدریسی — ٤ روپے

تحقیق و تحشیہ : ڈاکٹر مقبول احمد

ملنے کا پتا :

منیجر یونیورسٹی پبلیکیشنز ، ظہور وارڈ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فہرست مطبوعات ادارۂ علوم اسلامیہ

عربی

معرفة المذاهب — ۱ روپیا

تصحیح : ڈاکٹر عبدالعلیم

فضائل من اسمه أحمد أو محمد لابن بكير البغدادي — ۲ روپے

تصحیح و تحشیہ : ڈاکٹر مختار الدین احمد

المختار من شعر ابن الدّمينة إختيار الخالديين — ۵ روپے

تصحیح و تحشیہ : ڈاکٹر مختار الدین احمد

رسالة فى ضبط مواضع من الحماسة لأبي هلال العسكري — (زیر طبع)

تصحیح و تحشیہ : ڈاکٹر مختار الدین احمد

فارسی

برگزیدۂ شعر فارسی معاصر از ڈاکٹر منیب الرحمن (دو حصے) — ۲۰ روپے

جدید فارسی شاعری از ڈاکٹر منیب الرحمن (مجلد) — ۳ روپے

اردو

ہندستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق — ۱ روپیا

از ڈاکٹر عبدالعلیم

ترکی از ڈاکٹر اکمل ایوبی — ۷ روپے

عراق از ڈاکٹر محمود الحق — ۷ روپے

Qasim b. Qutlubugha al-Hanafi by Mr. Fazlur Rahman: The author has, in this second and concluding instalment of his monograph presente a comprehensive annotated bibliography of the works of Qasim b. Qutlubugha. The study of Qasim's writings reveals one of the most striking phenomenon of the history of fiqh—blending of the two different schools of Ahl al-Hadith and Ahl al-Rai—thus enabling us to understand the history of fiqh more clearly.

SHORT NOTES AND COMMUNICATIONS

Nawai ke Turki Ash'ar (Turkish verses of Nawai) by Dr. N. Akmal Ayyubi : Mir 'Ali Shir Nawai (1440-1501) was one of the most famous Turkish poets of central Asia. The writer of the present note has collected his Turkish verses mainly based on an old manuscript (*Bayaz*) preserved in the Maulana Azad Library of Aligarh Muslim University. The note contains an Urdu translation of these verses and is preceded by a short introduction.

MAJALLA-I 'ULŪM-I ISLĀMĪYA

Vol. 5 JUNE & DECEMBER 1964 Nos. 1, 2

SYNOPSIS OF CONTENTS

ARTICLES

'Araboṅ ka 'Ilm-ul-Muthallathat by Mr. Shabbir Ahmad Khan Ghori: The present writer published an article on the development of Trigonometry before Alberuni (*Majalla* June, 1961). Mr. Fazluddin Qureshy, Punjab University Lahore, disagreed on certain points raised therein (*Majalla* June 1963) which have been explained in the present article.

Sadruddin 'Ali b. Abi'l-Faraj al-Basri: by Dr. Mukhtar-ud-Din Ahmad: The Abbasid period in Arab History was most fruitful for the compilation of poetic collections. Several anthologies were prepared during this period apart from such collections as were made on the lines laid down by Abu Tammam (d. 850 A.D.). Among the most important *Hamasas* is the *Hamasat al Basriyya* by Sadr al-Din 'Ali b. Abi'l Faraj-al-Basri. Although complete obscurity surrounds the life of its author the work itself is fairly known and enjoys a widespread reputation. The article attempts to reconstruct the biography of the compiler with the help of scanty material available through historical and literary sources and to introduce *Hamasat-al-Basriyya* besides other *Hamasas* and anthologies of this kind which were prepared in the 7th century Hijra.

Farsi men 'Ilm Badi' ki Tarikh-o-Tadvin. (The development of the Science of Rhetoric in Persian) by Mr. Ashfaq Ali Khan: This article is in continuation of one pblished in the *Majalla* (December 1963). The present instalment attempts to give a critical analysis of the works of some of the Persian authorities on Rhetoric.